ماہنامہ

اشراق

لاہور

نومبر ۲۰۱۸ء

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

”انسان ایک ذی ارادہ و اختیار ہستی ہے، اِس وجہ سے بڑے سے بڑے عیش کو بھی وہ اپنی ہی شرائط پر پسند کرتا ہے۔ اُس کی فطرت کے اِس تقاضے کی رعایت سے اللہ تعالیٰ نے اپنے باایمان بندوں کے لیے جنت بھی ایسی بنائی ہے، جس میں وہ اپنی پسند کے مطابق جس طرح کا تنوع چاہیں گے، پیدا کر لیں گے۔ اُن کی کسی خواہش میں کوئی ادنیٰ رکاوٹ بھی حائل نہیں ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ عیش دوام اور اُس کے اندر حسب منشا تنوع اور رنگارنگی پیدا کرنے کی یہ آزادی اِس دنیا میں ہفت اقلیم کے کسی شاہنشاہ کو بھی نہ حاصل ہوئی، نہ حاصل ہو سکتی۔“

—— قرآنیات

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

المورد

ادارۂ علم و تحقیق

المورد ملت اسلامیہ کی عظیم علمی روایات کا امین ایک منفرد ادارہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کی ابتدا میں* یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل ملت میں صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن وسنت کی بنیاد پر دین حق کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ وتلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ دینی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن گئے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن وسنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول وفروع اور دوسروں کے مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

المورد کے نام سے یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس ادارے کا بنیادی مقصد دین کے صحیح فکر کی تحقیق وتنقید، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اُس کی نشر واشاعت اور اُس کے مطابق لوگوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

۱۔ عالمی سطح پر تذکیر بالقرآن کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ قرآن وسنت کے مطابق خدا کی شریعت اور ایمان واخلاق کی تعلیم دی جائے۔

۳۔ دین کے صحیح الفکر علما اور محققین کو فیلو کی حیثیت سے ادارے کے ساتھ متعلق کیا جائے اور اُن کے علمی، تحقیقی اور دعوتی کاموں کے لیے اُنھیں ضروری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۴۔ لوگوں کو آمادہ کیا جائے کہ جہاں جہاں ممکن ہے:

ا۔ اسلامی علوم کی ایسی درس گاہیں قائم کریں جن کا مقصد دین کے صحیح الفکر علما اور محققین تیار کرنا ہو۔

ب۔ ایف اے، ایف ایس سی اور اے لیول تک نہایت اعلیٰ معیار کے اسکول قائم کریں جن میں تعلیم وتعلم کے ساتھ طالب علموں کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشو ونما اور اُن کی دینی اور تہذیبی تربیت بھی پیش نظر ہو۔

ج۔ عام اسکولوں کے طلبہ کی دینی تعلیم کے لیے ایسے ہفتہ وار مدارس قائم کریں جن میں قرآن کی دعوت خود قرآن ہی کے ذریعے سے طالب علموں کے ذہن میں اِس طرح راسخ کر دی جائے کہ بعد کے زمانوں میں وہ پورے شرح صدر کے ساتھ اپنے دین پر قائم رہ سکیں۔

د۔ ایسی خانقاہیں قائم کریں جہاں لوگ وقتاً فوقتاً اپنے دنیوی معمولات کو چھوڑ کر آئیں، علما وصالحین کی صحبت سے مستفید ہوں، اُن سے دین سیکھیں اور چند روز کے لیے یک سوئی کے ساتھ ذکر وعبادت میں مشغول رہ کر اپنے لیے پاکیزگی قلب و نظر کا اہتمام کریں۔

---

* شعبان ۱۴۰۳ھ بمطابق جون ۱۹۸۳ء۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ماہنامہ

اشراق

لاہور

جلد ۳۰ شمارہ ۱۱ نومبر ۲۰۱۸ء صفر المظفر / ربیع الاول ۱۴۴۰ھ

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

سید منظور الحسن

فی شمارہ 30روپے
سالانہ 300روپے
رجسٹرڈ 700روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر)

بیرون ملک

سالانہ 30ڈالر

فہرست

شذرات

ماخذ دین کی بحث: جناب جاوید احمد غامدی سے ایک گفتگو — سید منظور الحسن — ۴

قرآنیات

البیان: الانبیاء ۲۱: ۹۵-۱۱۲ (۴) — جاوید احمد غامدی — ۱۰

معارف نبوی

ایمان کا ایک تقاضا — جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس — ۱۷

سیر و سوانح

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا (۱۱) — محمد وسیم اختر مفتی — ۲۶

مقالات

واقعۂ نوح — رضوان اللہ — ۴۳

نقد و نظر

'جدید' مسلم — طالب محسن — ۵۸

قربانی سے پہلے بال اور ناخن نہ کاٹنا — محمد حسن الیاس — ۶۴

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

Post Box 5185, Lahore, Pakistan.
www.ghamidi.net, www.javedahmadghamidi.com
https://www.facebook.com/javedahmadghamidi
http://www.javedahmadghamidi.com/index.php/ishraq

شذرات

سید منظور الحسن

ماخذ دین کی بحث: جناب جاوید احمد غامدی سے ایک گفتگو

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

[یہ سوال و جواب استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کے ساتھ میری ایک گفتگو سے ماخوذ ہیں۔ ۲۰۱۳ء میں امام شافعی کی کتاب ''الرسالہ'' کی تدریس کے دوران میں ایک مبتدی طالب علم کے اشکالات کو رفع کرنے کے لیے استاذ گرامی نے جو گفتگو فرمائی، اسے میں نے اپنے فہم کے لحاظ سے مرتب کیا ہے۔ امید ہے کہ ماخذ دین کی بحث میں دل چسپی رکھنے والے طالب علموں کے لیے یہ افادیت کا باعث ہو گی۔]

سوال: امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الرسالہ'' میں 'فجماعُ ما أَبانَ اللّٰہُ لِخلقہِ في کتابہ' (اللہ نے اپنی کتاب میں جو کچھ مخلوق کے لیے مجموعی طور پر بیان کیا) کے زیر عنوان جو بحث کی ہے، اس سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ امام صاحب ان احکام کو جو اصلاً قرآن مجید میں مذکور نہیں ہیں اور جنھیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری فرمایا ہے، قرآن مجید ہی پر مبنی قرار دیتے ہیں اور اس کے لیے 'اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ'[1] اور 'یُعَلِّمُھُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ'[2] کے نصوص کو بنیاد بناتے ہیں۔ اس سے کیا یہ بات اخذ کرنا درست ہے کہ امام صاحب بہ اعتبار ترتیب قرآن مجید کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مقدم مان رہے ہیں؟ اگر یہ

۱؎ النساء۴: ۵۹۔

۲؎ البقرہ۲: ۱۲۹۔

درست ہے تو اس پر کیا یہ اعتراض وارد نہیں ہوتا کہ انھوں نے ایک خلاف واقعہ بات کو بنیاد بنایا ہے؟

مزید برآں، اس کے نتیجے میں کیا یہ بحث پیدا نہیں ہوتی کہ آیا ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کی بنیاد پر مانتے ہیں یا قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیاد پر؟

جواب: ۱۔ آپ کے سوالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام شافعی کی بات کو صحیح زاویۂ نظر سے نہیں سمجھا گیا۔ یہ تعلق کا مغالطہ ہے جس سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔ امام صاحب یہاں ایمان بالرسالت کی بات نہیں کر رہے، بلکہ اخذ دین کی بات کر رہے ہیں۔ ایمانیات ان کی اس کتاب کا موضوع ہی نہیں ہے۔ دیگر اصولیین بھی جب اس تناظر میں کلام کرتے ہیں تو وہ ایمانیات کے حوالے سے نہیں، بلکہ ماخذ دین کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ وہ مباحث ہیں جنھیں میں نے اپنی کتاب ''میزان'' میں ''اصول و مبادی'' کے زیر عنوان بیان کیا ہے۔ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول کیوں مانتے ہیں اور کیسے مانتے ہیں؟ یہ ماخذ دین کے نہیں، ایمانیات کے مباحث ہیں۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ایمان بالرسالت کی کوئی خاص منطقی ترتیب نہیں ہوسکتی۔ صحابۂ کرام براہ راست ایمان لائے تھے، ہم اپنے والدین کی شہادت پر ایمان لائے، ایک غیر مسلم ہوسکتا ہے کہ قرآن پڑھ کر ایمان لے آئے۔

۲۔ اگر آپ یہ پوچھیں کہ ماخذ دین کی من جانب اللہ ترتیب کیا ہے تو وہ وہی ہے جسے میں نے ''اصول و مبادی'' میں بیان کیا ہے کہ دین کا تنہا ماخذ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ سے ملنے والا یہ دین قرآن و سنت میں پایا جاتا ہے۔ اگر بہ اعتبار حقیقت دیکھا جائے گا تو یہی ترتیب ہوگی، بہ اعتبار علم دیکھا جائے تب بھی یہی ترتیب ہوگی، مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ میں اس بات کی تائید کے لیے قرآن کی آیت نقل کروں گا، کیونکہ وہ مستند ترین صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ سنت تو اس بات کی محتاج ہے کہ اس کو تلاش کیا جائے، مگر قرآن متعین صورت میں موجود ہے۔ (واضح رہے کہ اصولیین قرآن کو ماخذ اول اس لیے بھی قرار دیتے ہیں کہ وہ نزاع سے بالا ہے)۔

۳۔ جہاں تک امام شافعی اور دیگر اصولیین کے قرآن مجید کو اخذ دین کی بنیاد بنانے کے طرز فکر کا تعلق ہے تو اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ وہ کتاب الٰہی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مقدم مانتے ہیں اور اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں اور پھر قرآن نازل ہوا ہے، بلکہ یہ ان کی presentation ہے۔ انھوں نے اس صورت حال میں کہ دین قرآن میں بھی موجود ہے اور اس کے باہر بھی ہے، یہ presentation اختیار کی کہ اولاً قرآن ہے اور جو کچھ (سنت کی صورت میں) قرآن سے باہر ہے، اسے قبول کرنے کی دلیل بھی خود قرآن ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اب سوال یہ ہے کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے مقابلے میں جو لوگ (خوارج وغیرہ) کھڑے تھے، وہ یہ کہہ رہے تھے کہ یہ 'کتاب اللّٰہ' ہے، 'ما أنزل اللّٰہ' ہے، 'تَفۡصِیۡلاً لِّکُلِّ شَیۡءٍ'[3] ہے، لہٰذا اس کے باہر جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس تناظر میں امام صاحب نے سنت کے اثبات کے لیے بھی قرآن ہی کو دلیل بنایا۔ گویا انھوں نے اپنے مخاطبین کو بتایا کہ جس کتاب کو تم مان رہے ہو، وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کو وہی دینی حیثیت دے رہی ہے جس پر ہم اصرار کر رہے ہیں۔

۴۔ ہمارے علما دین کو قرآن مجید سے شروع کرتے ہیں۔ اگر قرآن میں ہر چیز کی تفصیل ہوتی تو پھر یہی طریقہ بجا تھا۔ اس صورت میں پیچھے جانے کی ہرگز ضرورت نہیں تھی۔ پھر ہم یہ کہتے کہ قرآن آیا تو آخر میں ہے، لیکن اس نے تمام سابقہ علم کا احاطہ کر لیا ہے، مگر واقعے میں ایسا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر نماز جس کی سب سے زیادہ تاکید کی گئی ہے، اس کی کوئی تفصیل قرآن میں مذکور نہیں ہے۔ قرآن کا اس صورت میں ہونا وہ واقعہ ہے جو پیچھے دیکھنے کی ضرورت کو پیدا کرتا ہے۔ اس واقعے کو صحیح زاویے سے نہ لینا ہی ہمارے علما کی اصل غلطی ہے۔ وہ غلطی یہ کر رہے ہیں کہ قرآن کو حضرت آدم سے شروع کر رہے ہیں۔ جہاں تک میرا معاملہ ہے تو میرے نزدیک بنیادی مسئلہ ذرائع دین کا نہیں، بلکہ اس دینی تسلسل کا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے سے چلا آ رہا ہے اور اس content کا ہے جس کے نتیجے میں قرآن پہلی نہیں، بلکہ آخری کتاب کے طور پر سامنے آتا ہے۔

آپ مسئلے کو اس طرح سمجھیے کہ گذشتہ ۱۴ صدیوں میں ہمارے اہل علم کو اس سوال کا سامنا رہا ہے کہ جب قرآن کی صورت میں مستند ترین اور متعین ذریعۂ دین موجود ہے تو پھر اس سے باہر جانے کی ضرورت کیا ہے؟ ہمارے علما اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ضرورت خود قرآن کی پیدا کردہ ہے، کیونکہ اس نے مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کی تبیین کی ذمہ داری ڈالی ہے، جب کہ میں اس کے جواب میں اس امر واقعہ کو بیان کرتا ہوں کہ قرآن میں دین کا پورا content بیان ہی نہیں ہوا۔

سوال: امام شافعی کی بحث کو کس زاویے سے لینا ہے، اس پہلو سے تو آپ کی بات سمجھ میں آ گئی ہے، مگر اس کے باوجود میں ایمان بالرسالت اور ماخذ دین کے مباحث کو الگ الگ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ مجھے ابھی بھی یہ دونوں بحثیں لازم و ملزوم لگ رہی ہیں۔ میرے خیال میں نبی کو نبی ماننے کا مقصد ہی یہ ہے کہ دین کو حاصل کیا جائے اور اس حاصل شدہ دین کی بنا پر ایمان و عمل کے احکام کو متعین کیا جائے۔ میں

---

[3] الانعام ۶: ۱۵۴۔

اصل میں دین اخذ کرنے کے عمل اور ایمان لانے کے عمل میں کوئی تفریق نہیں کر پا رہا، کیونکہ مجھے دونوں کا نتیجہ ایک ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس تناظر میں یہ بھی واضح کر دیجیے کہ اجماع و تواتر اور اخبار آحاد سے دین اخذ کرنے کے معاملے میں آپ میں اور دیگر اہل علم میں اپروچ کا کیا فرق ہے؟

جواب: ۱۔ آپ اصل میں دو چیزوں کو خلط ملط کر رہے ہیں: ایک واقعے کے جاننے کو اور دوسرے ایمان لانے کو۔ یہ واقعے کو جاننا ہے کہ محمد بن عبد اللہ ایک شخصیت تھے جنھوں نے عرب میں نبوت کا اعلان کیا تھا، قرآن پیش کیا تھا، سنت جاری کی تھی۔ یہ ایمان لانا نہیں ہے۔ ایمان لانا یہ ہے کہ ہم محمد بن عبد اللہ کو جنھوں نے عرب میں نبوت کا اعلان کیا تھا، قرآن پیش کیا تھا، سنت جاری کی تھی، اللہ کا پیغمبر اور اس کا رسول مانتے ہیں اور اس حیثیت سے آپ کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ واقعے کو جاننے اور ایمان لانے میں یہی وہ فرق ہے جو ایک مستشرق کی شکل میں بالکل نمایاں ہو جاتا ہے۔ وہ واقعے کے وقوع پر تو کامل یقین رکھتا ہے، مگر بہ حیثیت پیغمبر آپ پر ایمان نہیں لاتا اور آپ کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرتا۔

یہ واقعہ ہمیں اجماع اور تواتر سے معلوم ہوتا ہے۔ اجماع اور تواتر کسی علم، کسی خبر کو منتقل کرنے کا سیکولر ذریعہ ہے۔ یہ ذریعہ واقعے پر یقین کو تو لازم کرتا ہے، مگر ایمان کو لازم نہیں کرتا۔ گویا اجماع اور تواتر میرے لیے ذریعۂ خبر ہے، نہ کہ وجہ استدلال۔ یعنی اجماع اور تواتر سے مجھے ایمان نہیں حاصل ہوتا، واقعے کا یقین حاصل ہوتا ہے۔

''میزان'' کا آغاز میں نے اسی بیانِ واقعہ سے کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ یہ واقعہ مجھے اجماع و تواتر سے معلوم ہوا ہے۔

اس بات کو ذہن نشین رکھیے کہ جب میں ''میزان'' میں، امام شافعی ''الرسالہ'' میں یا کوئی اور صاحب علم اپنی کتاب میں ماخذ دین کو بیان کرتا ہے تو وہ واقعے سے استخراج کر رہا ہوتا ہے، ایمان سے استخراج نہیں کر رہا ہوتا۔ یعنی ہم یہ بتا رہے ہوتے ہیں کہ ہم دین کو اخذ کیسے کر رہے ہیں، یہ نہیں بتا رہے ہوتے کہ فلاں فلاں بات پر ہم کیوں اور کیسے ایمان لائے ہیں۔ چنانچہ یہ واضح رہے کہ واقعے سے استخراج کے لیے ایمان ناگزیر نہیں ہے۔

۲۔ کسی کی کوئی بات سمجھنی ہو تو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کو الجھن کہاں سے پیدا ہوئی ہے۔

کیا آپ متعین طور پر بتا سکتے ہیں کہ امام شافعی سے لے کر مولانا مودودی تک مسلمانوں کے علم کی الجھن کیا ہے؟

—— یہ الجھن اخبار آحاد کا وجود پذیر ہونا ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے انفرادی ذرائع سے بعض ایسی باتیں سامنے آ گئی ہیں جن کے بارے میں علم و عقل یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ باتیں آپ ہی کی ہو سکتی ہیں۔ علم و عقل

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کی اس گواہی کے بعد ان سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔ اب ان کا کیا کیا جائے؟ یہ باتیں کتاب الٰہی پر بھی اثر انداز ہو رہی ہیں اور دین کے content پر بھی۔ ان کو کہیں بٹھانا ہے، ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہے امام شافعی کی الجھن۔ یعنی وہ (زبانِ حال سے) یہ کہتے ہیں کہ اگر میں انھیں نہیں مانتا تو میرا علم و عقل کہتا ہے کہ میں غلطی کر رہا ہوں۔

ایک چیز ہے منطقی طور پر کسی چیز کا یقینی یا ظنی ہونا اور ایک چیز ہے آپ کا نفسیاتی طور پر اس کو یقینی یا ظنی حیثیت دینا۔ اس کو ہمارے علما ایسے بیان کرتے ہیں کہ بات محفوف بالقرائن ہو گئی ہے۔ یعنی ہے تو وہ خبر واحد ہی، مگر اس کے گرد اس قدر قرائن جمع ہو گئے ہیں اور انھوں نے اس کو گھیر کر اس جگہ پہنچا دیا ہے کہ جہاں میں اسے منطقی طور پر تو یقینی نہیں کہہ سکتا، لیکن میرے یقین میں کوئی کمی بھی نہیں ہوتی۔ یہ الجھن ہے۔

اس الجھن کے تناظر میں جب آپ ''الرسالہ'' کو پڑھیں گے تو آپ کو ان کی بات زیادہ سمجھ میں آئے گی اور پھر آپ کو معلوم ہو گا کہ ''الرسالہ'' اصل میں اخبار آحاد کی حجیت ثابت کرنا چاہتی ہے۔ اس کی ساری بحثیں آپ کو اسی محور کے گرد گھومتی نظر آئیں گی۔ یہی وہ مقصود ہے جس کو حاصل کرنے لیے امام شافعی اور ان کے بعد مولانا مودودی تک، سب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کو اسٹیبلش کرتے ہیں اور آپ کے مامور من اللہ اور مطاع ہونے کو بنیاد بناتے ہیں۔ یہ ساری بحثیں ان کو اس لیے کرنی پڑی ہیں کہ آں جناب صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ ایسی چیزیں پہنچ گئی ہیں جن کا انکار کرنا مکابرت ہے۔ یعنی سلف یا راسخ العقیدہ علما بالکل بجا طور پر اپنے ضمیر میں یہ محسوس کرتے ہیں کہ اخبار آحاد کو رد کرنا صریحاً خلاف علم و عقل بات ہے۔

وہ اس مکابرت پر نہیں اترتے جس طرح کی بات اسلم جیراج پوری اور پرویز صاحب کرتے ہیں کہ یہ ایک عجمی سازش ہے۔ پھر یہ درازنفسی شروع ہو جاتی ہے کہ دیکھیے دو تین سو سال ہو گئے تھے، اس کے بعد امام بخاری اٹھے، جن کا تعلق عرب سے نہیں، بلکہ بخارا سے تھا وغیرہ وغیرہ ... یہ طرز استدلال یہ نہیں کہتا کہ تمام اخبار آحاد غلط ہیں، بلکہ یہ کہتا ہے کہ یہ جس طریقے سے ہم تک پہنچے ہیں، اس کے بعد یہ، یہ حیثیت ہی نہیں رکھتے کہ ان کو کسی طریقے سے بھی قرآن پر یا دین پر اثر انداز ہونے دیا جائے۔

یعنی یوں سمجھیے کہ ایک طریقہ یہ تھا کہ اخبار آحاد کے مشمولات کو ناقابل اعتبار قرار دے کر قرآن کو اور دین کو ان سے مجرد کر دیا جائے۔ پرویز صاحب، اسلم جیراج پوری صاحب، عبداللہ چکڑالوی صاحب اور اس طرح کے بعض دوسرے لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ ایک جانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کی بنیاد پر ان اخبار آحاد کے اثبات کے عمل کو آخری درجے میں موکد کیا جائے اور دوسری جانب قرآن کا ان پر انحصار ثابت کیا

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جائے اور یہ واضح کیا جائے کہ وہ تو یہ بھی نہیں بتا رہا کہ چور کا ہاتھ کہاں سے کاٹنا ہے۔ یہ وہ طریقہ ہے جسے امام شافعی سے لے کر مولانا مودودی تک، ہمارے علما نے اختیار کیا ہے۔ درمیان میں ایک بڑا آدمی ابن حزم کھڑا ہے جس نے ان سے ہٹ کر ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ اس نے کہا کہ خدا کی حفاظت جس طرح قرآن کو حاصل ہے، اسی طرح اخبار آحاد کو بھی حاصل ہے۔

میں نے اس کے بجائے حقیقت واقعہ کو بیان کرنے کی اپروچ اختیار کی ہے۔ میں نے یہ بتایا ہے کہ اخبار آحاد سے حاصل ہونے والا علم قرآن و سنت ہی میں محصور دین کی تفہیم و تبیین ہے، اس لیے نہ یہ قرآن پر اثر انداز ہوتا ہے اور نہ دین کے content میں کوئی اضافہ کرتا ہے۔ جب اس کی نوعیت یہ ہے تو نہ مجھے اس کی تردید کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ناگزیر ہونا ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس بات کو پوری طرح واضح کر دیا جائے کہ یہ قرآن و سنت میں محصور دین کی کیسے تفہیم و تبیین کر رہے ہیں۔

واضح رہے کہ میں نے مسئلہ حل کرنے کے لیے کوئی راستہ نہیں نکالا، بلکہ واقعے کی اصل حقیقت کو بیان کیا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قرآنیات

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الانبیاء

(۴)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۹۵﴾ حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ

(اب[۲۹۳] اِن منکروں کے زیادہ درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اے پیغمبر۔ اِس لیے کہ) ہم نے جس بستی والوں کے لیے (اپنے قانون کے مطابق) ہلاکت مقدر کر رکھی ہے[۲۹۴]، اُن کے لیے حرام ہے کہ وہ حق کی طرف رجوع کریں[۲۹۵]، اِس لیے کہ وہ کبھی رجوع نہ کریں گے، یہاں تک کہ وہ وقت آجائے،

۲۹۳؎ یہاں سے آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ اِن میں اُسی مضمون کو ازسرنو لے لیا ہے، جس سے سورہ شروع ہوئی تھی۔ یہ 'عود علی البدء' کا اسلوب ہے۔ اِس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اصل مدعا اگر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے تو خاتمۂ کلام میں اُس کو ایک مرتبہ پھر مخاطب کے ذہن میں تازہ کر دیا جائے۔

۲۹۴؎ آیت میں فعل 'اَهْلَكْنَا' استعمال ہوا ہے۔ یہ فیصلۂ فعل کے معنی میں ہے۔

۲۹۵؎ یہ فقرہ اصل میں محذوف ہے۔ اِس کی وضاحت 'اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ' کے جملے نے کر دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے مخاطبین سنت الٰہی کی زد میں آچکے ہیں، اِس لیے اب یہ اُسی انجام کو پہنچیں گے، جس کو پچھلی

يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿٩٦﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ

جب یاجوج و ماجوج کھول دیے جائیں[296] اور وہ ہر بلندی سے پل پڑیں اور (قیامت کا) وعدۂ برحق

قومیں پہنچی ہیں۔ اِن کے لیے ممکن نہیں ہے کہ توبہ و انابت کی توفیق پائیں اور باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف رجوع کر لیں۔ اِن کی ہٹ دھرمی کے باعث اِن کے لیے ہلاکت مقدر ہو چکی ہے۔

۲۹۶ یعنی ظہور قیامت کے قطعی آثار نمودار ہو جائیں اور اُس کے بارے میں کسی بحث کی گنجایش نہ رہے۔ اگلی آیت سے واضح ہے کہ یاجوج و ماجوج کے خروج کے بعد یہی صورت پیدا ہو جائے گی۔ یہ دونوں نوح علیہ السلام کے بیٹے یافث کی اولاد میں سے ہیں جو ایشیا کے شمالی علاقوں میں آباد ہوئی۔ پھر اُنھی کے بعض قبائل یورپ پہنچے اور اِس کے بعد امریکا اور آسٹریلیا کو آباد کیا۔ صحیفۂ حزقی ایل میں اِن کا تعارف روس، ماسکو اور توبالسک کے فرماں روا کی حیثیت سے کرایا گیا ہے۔ حزقی ایل فرماتے ہیں:

''اور خداوند کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ اے آدم زاد، جوج کی طرف جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش اور مسک اور توبل کا فرماں روا ہے متوجہ ہو اور اُس کے خلاف نبوت کر۔'' (۳۸: ۱-۲)

''پس اے آدم زاد، تو جوج کے خلاف نبوت کر اور کہہ: خداوند یوں فرماتا ہے: دیکھ اے جوج، روش، مسک اور توبل کے فرماں روا، میں تیرا مخالف ہوں اور میں تجھے پھرا دوں گا اور تجھے لیے پھروں گا اور شمال کی دور اطراف سے چڑھا لاؤں گا۔'' (۳۹: ۱-۲)

یوحنا عارف کے مکاشفے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن کے خروج کی ابتدا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ایک ہزار سال بعد کسی وقت ہو گی۔ اُس زمانے میں یہ زمین کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوں گے۔ اِن کا فساد جب انتہا کو پہنچے گا تو ایک آگ آسمان سے اترے گی اور قیامت کا زلزلہ برپا ہو جائے گا:

''اور جب ہزار برس پورے ہو چکیں گے تو شیطان قید سے چھوڑ دیا جائے گا اور اُن قوموں کو جو زمین کی چاروں طرف ہوں گی، یعنی جوج و ماجوج کو گم راہ کر کے لڑائی کے لیے جمع کرنے کو نکلے گا۔ اُن کا شمار سمندر کی ریت کے برابر ہو گا، اور وہ تمام زمین پر پھیل جائیں گی اور مقدسوں کی لشکر گاہ اور عزیز شہر* کو چاروں طرف سے گھیر لیں گی اور آسمان پر سے آگ نازل ہو کر اُنھیں کھا جائے گی۔'' (مکاشفہ ۲۰: ۷-۹)

* 'مقدسوں کی لشکر گاہ' سے مراد مدینہ اور 'عزیز شہر' سے مراد شہر امین مکہ ہے۔ یہ تعبیرات اتنی واضح ہیں کہ الہامی صحائف کے اسالیب اور اِن شہروں کی تاریخ سے واقف کسی شخص کو اِنھیں سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فَاِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ اَبۡصَارُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يٰوَيۡلَنَا قَدۡ كُنَّا فِيۡ غَفۡلَةٍ مِّنۡ هٰذَا بَلۡ كُنَّا ظٰلِمِيۡنَ ﴿۹۷﴾

اِنَّكُمۡ وَمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنۡتُمۡ لَهَا وٰرِدُوۡنَ ﴿۹۸﴾ لَوۡ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوۡهَا وَكُلٌّ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۹۹﴾ لَهُمۡ فِيۡهَا زَفِيۡرٌ وَّهُمۡ فِيۡهَا لَا يَسۡمَعُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾

قریب آ جائے تو ناگہاں اِن منکروں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں اور بول اٹھیں کہ ہاے ہماری کم بختی! ہم اِس سے غفلت میں پڑے رہے، بلکہ ہم ظالم تھے[۲۹۷]۔ ۹۵-۹۷

تم اور تمھارے معبود جن کو اللہ کے سوا پوجتے رہے ہو[۲۹۸]، اب جہنم کا ایندھن ہیں۔ تم (روؤ یا فریاد کرو)، اُس میں داخل ہو کر رہو گے۔ اگر یہ واقعی معبود ہوتے تو اُس میں نہ پڑتے —— (یہ پوجنے والے اور جن کو پوجا گیا)، سب ہمیشہ اُسی میں رہیں گے۔ اب پوجنے والوں کو اُس میں چلانا ہے اور جن کو پوجتے رہے ہو، اُن کا حال یہ ہوگا کہ اُس میں کچھ نہ سنیں گے[۲۹۹]۔ ۹۸-۱۰۰

۲۹۷؎ یعنی یہ بات بھی نہیں کہ ہمیں کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا اور ہم غفلت میں پڑے رہے، بلکہ خبردار کرنے والوں کو جھٹلا کر اور اُن کی تنبیہات کا مذاق اڑا کر یہ ظلم اپنی جانوں پر ہم نے خود ڈھایا ہے۔

۲۹۸؎ یعنی تمھارے اصنام و احجار۔ یہاں چونکہ مشرکین عرب مخاطب ہیں، اِس لیے وہی مراد ہوں گے۔ آیت میں اِن کے لیے 'مَا' کا استعمال اِس کا مزید قرینہ ہے۔ قرآن نے دوسری جگہ 'وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ' کے الفاظ میں اِس کی تصریح کر دی ہے۔ اِنھیں جہنم کا ایندھن بنانے سے مقصود اِن پتھروں کو سزا دینا نہیں ہے، بلکہ اِن کے پوجنے والوں کی فضیحت ہے کہ دیکھ لو، جن کو معبود بنا کر پوجتے رہے ہو، اُن پر یہاں کیا گزر رہی ہے۔ اِن کے ساتھ، البتہ اُن جنوں اور انسانوں کو بھی شامل سمجھیے جنھوں نے پسند کیا کہ اللہ کے بجاے اُن کی بندگی کی جائے۔

۲۹۹؎ اصل الفاظ ہیں: 'هُمۡ فِيۡهَا لَا يَسۡمَعُوۡنَ'۔ آیت پر غور کیا جائے تو بادنیٰ تامل واضح ہو جاتا ہے کہ 'هُمۡ' کا مرجع پوجنے والوں کے معبود ہی ہیں جن کے لیے اوپر 'وَمَا تَعۡبُدُوۡنَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ بظاہر انتشار ضمیر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ
حَسِيْسَهَا وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ
وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

جن کے لیے، البتہ ہماری طرف سے اچھے انجام کا وعدہ ہو چکا ہے[۳۰۰]، وہ اُس سے دور رکھے جائیں گے، وہ اُس کی آہٹ بھی نہ سنیں گے اور ہمیشہ اپنے من بھاتے عیش میں رہیں گے۔[۳۰۱] وہ بڑی گھبراہٹ[۳۰۲] اُن کو ذرا غم میں نہ ڈالے گی اور خدا کے فرشتے اُن کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ اور کہیں گے: یہ تمھارا وہی دن ہے، جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ۱۰۱-۱۰۳

ہے، لیکن مرجع میں التباس کا اندیشہ نہ ہو تو استاذ امام کے الفاظ میں، یہ ایجاز کے پہلو سے کلام کا حسن ہے۔ اِس کے ساتھ یہ امر بھی واضح رہے کہ یہاں ضمیر اور فعل پوجنے والوں کے تصور کے لحاظ سے وہی استعمال ہوئے ہیں جو ذی عقل ہستیوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں، اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تو اُنھیں سمیع و بصیر سمجھ کر ہی اُن سے دعائیں کرتے اور اُن کے پورا ہونے کی توقع رکھتے تھے۔

۳۰۰؎ اِس وعدے کا ذکر پیچھے آیت ۹۴ میں گزر چکا ہے۔

۳۰۱؎ یہ اِس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ اُنھیں جو کچھ دیا جائے گا، اُس کی یکسانی اُنھیں کبھی افسردہ نہ کرے گی کہ اُس سے اکتا کر وہ آگے کسی چیز کی خواہش کریں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...انسان ایک ذی ارادہ و اختیار ہستی ہے، اِس وجہ سے بڑے سے بڑے عیش کو بھی وہ اپنی ہی شرائط پر پسند کرتا ہے۔ اُس کی فطرت کے اِس تقاضے کی رعایت سے اللہ تعالیٰ نے اپنے باایمان بندوں کے لیے جنت بھی ایسی بنائی ہے، جس میں وہ اپنی پسند کے مطابق جس طرح کا تنوع چاہیں گے، پیدا کر لیں گے۔ اُن کی کسی خواہش میں کوئی ادنیٰ رکاوٹ بھی حائل نہیں ہو گی۔ ظاہر ہے کہ یہ عیش دوام اور اُس کے اندر حسب منشا تنوع اور رنگارنگی پیدا کرنے کی یہ آزادی اِس دنیا میں ہفت اقلیم کے کسی شاہنشاہ کو بھی نہ حاصل ہوئی، نہ حاصل ہو سکتی۔''

(تدبر قرآن ۵/ ۱۹۳)

۳۰۲؎ یہ اُس گھبراہٹ اور ہلچل کی طرف اشارہ ہے جو نفخ صور کے بعد تمام کائنات میں برپا ہو گی۔ اِس کی ہول ناک تصویر قرآن کے آخری باب کی سورتوں میں دیکھ لی جا سکتی ہے۔

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ
وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿١٠٤﴾
وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ

اُس دن، جب کہ ہم آسمان کو لپیٹ دیں گے، جس طرح طومار میں اوراق لپیٹ دیے جاتے ہیں۔ ہم نے جس طرح پہلی خلقت[303] کی ابتدا کی تھی، اُسی طرح ہم اُس کا اعادہ کر دیں گے۔ یہ ہمارے ذمے ایک حتمی وعدہ ہے[304]، ہم اِس کو ضرور کر کے رہیں گے۔ ۱۰۴
ہم نے پند و نصیحت کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا[305] کہ (اُس دن جو) زمین[306] (وجود میں آئے گی، اُس)

۳۰۳؎ اصل میں 'اَوَّلَ خَلْقٍ' کے الفاظ ہیں۔ یہ یہاں ظرف کے محل میں ہیں، جس طرح دوسرے مقامات میں اِسی مضمون کو ادا کرنے کے لیے 'اَوَّلَ مَرَّةٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔

۳۰۴؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَعْدًا عَلَيْنَا'۔ اِن میں مصدر تاکید کے لیے ہے۔ ہم نے ترجمہ اِسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۳۰۵؎ یہ زبور کے مزمور ۳۷ کا حوالہ ہے۔ اِسے دیکھیے تو اِس کی نوعیت ایک ترکیب بند کی ہے، جس میں موعظت و نصیحت کی باتوں کے بعد بار بار ایک ترجیع یا ٹیپ کے مصرعے کی طرح یہ بات دہرائی جاتی ہے کہ زمین کے وارث خدا کے نیک اور متقی بندے ہوں گے اور یہ وراثت ابدی ہو گی۔ آیت میں 'مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ' کے الفاظ سے قرآن نے اِسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اِس کے چند الفاظ یہ ہیں:

> ''اور بدی کرنے والوں پر رشک نہ کر... خداوند پر توکل کر اور نیکی کر... وہ تیری راست بازی کو نور کی طرح اور تیرے حق کو دوپہر کی طرح روشن کرے گا۔ کیونکہ بدکردار کاٹ ڈالے جائیں گے، لیکن جن کو خداوند کی آس ہے، ملک کے وارث ہوں گے۔ کیونکہ تھوڑی دیر میں شریر نابود ہو جائے گا۔ تو اُس کی جگہ غور سے دیکھے گا پر وہ نہ ہو گا، لیکن حلیم ملک کے وارث ہوں گے اور سلامتی کی فراوانی سے شادمان رہیں گے... اُن کی میراث ہمیشہ کے لیے ہو گی... صادق زمین کے وارث ہوں گے اور اُس میں ہمیشہ بسے رہیں گے۔'' (۱-۲۹)

استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر اترے ہوئے نغمات الٰہی کا مجموعہ ہے۔ حضرت داؤد، جیسا کہ اِسی سورہ میں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً
لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ اِنَّمَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۸﴾
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰی سَوَآءٍ وَاِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔ اِس میں اُن لوگوں کے لیے بڑی آگاہی[۳۰۷] ہے جو (ہماری) بندگی کرنے والے ہیں۔ (یہ تم سے عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں) اور ہم نے، (اے پیغمبر)، تم کو جو بھیجا ہے تو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ اِن سے کہہ دو کہ میری طرف تو صرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے تو کیا تم اپنے آپ کو اُس کے حوالے کرتے ہو؟ پھر اگر وہ اعراض کریں تو کہہ دو کہ میں نے تم سب کو یکساں خبردار کر دیا ہے[۳۰۸]۔ میں نہیں جانتا کہ وہ وقت قریب ہے یا دور جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔ (اب معاملہ خدا کے حوالے

بیان ہوا ہے، نبی بھی تھے اور اس زمین کے ایک جلیل القدر بادشاہ بھی۔ ایک بادشاہ کی زبان ہی سے یہ اعلان سب سے زیادہ موزوں ہو سکتا تھا کہ زمین کے حقیقی اور آخری وارث صرف اللہ کے نیک بندے ہی ہوں گے۔ جب ایک صاحب جبروت بادشاہ اِس حقیقت کی منادی کر گیا ہے تو کسی دوسرے کے لیے اِس میں مجال سخن کہاں باقی رہی!'' (تدبر قرآن ۵/ ۱۹۸)

۳۰۶؎ اصل میں لفظ 'الْاَرْض' استعمال ہوا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ اُس کے وارث بلاشرکت غیرے صرف اللہ کے نیکوکار بندے ہوں گے۔ یہی بات زبور کے اُس مزمور میں بیان ہوئی ہے، جس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اُس میں مزید صراحت ہے کہ یہ وراثت ابدی ہو گی۔ اِس سے واضح ہے کہ 'الْاَرْض' سے مراد یہاں اُس جہان نو کی زمین ہے جو قیامت کے بعد نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ وجود میں آئے گی۔ سورۂ ابراہیم (۱۴) کی آیت ۴۸ میں اُسی کے بارے میں فرمایا ہے: 'یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ' (اُس دن کو یاد رکھو، جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی)۔

۳۰۷؎ اصل میں لفظ 'بَلٰغًا' آیا ہے۔ اِس کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے اور اپنے مدعا کے لحاظ سے یہ عام منادی اور عام بشارت، دونوں کو شامل ہے۔

۳۰۸؎ یعنی امیر و غریب، چھوٹے بڑے، لیڈر اور پیرو، سب کو بغیر کسی فرق و تمیز کے خبردار کر دیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ
وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۱۱۱﴾
قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

ہے)۔ بے شک، وہی جانتا ہے اُس کو بھی جو سامنے کہہ رہے ہو اور اُس کو بھی جسے تم چھپاتے ہو۔[۳۰۹] اور مجھے نہیں معلوم، شاید یہ فرصت تمھارے لیے ایک آزمایش اور ایک خاص وقت تک فائدہ اٹھا لینے کی مہلت ہو۔ ۱۰۵-۱۱۱

پیغمبر نے دعا کی کہ میرے پروردگار، حق کے ساتھ فیصلہ کر دے، اور فرمایا: ہمارا پروردگار رحمٰن ہی ہے، جس سے ہم اُن باتوں کے مقابلے میں مدد مانگتے ہیں جو تم بیان کرتے ہو۔[۳۱۰] ۱۱۲

۳۰۹؎ مطلب یہ ہے کہ تم جو مطالبہ مجھ سے کر رہے ہو، اُس کو بھی جانتا ہے اور اُس کو بھی جو اُس مطالبے کی تہ میں چھپا ہوا ہے۔ اُس پر سب کچھ واضح ہے، اِس لیے وہی اپنے قانون اور اپنی حکمت کے مطابق فیصلہ کرے گا کہ تمھارے ساتھ اب کیا کرنا ہے۔

۳۱۰؎ سورہ کے آخر میں یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا بھی ہے اور ہجرت و براءت کے اِس مرحلے میں اپنے منکرین کو وداع بھی۔ اِس کے بعد، ظاہر ہے کہ صرف فیصلے ہی کا انتظار باقی رہ جاتا ہے۔

کوالالمپور

۱۵/اپریل ۲۰۱۳ء

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معارف نبوی

جاوید احمد غامدی

تحقیق و تخریج: محمد حسن الیاس

ایمان کا ایک تقاضا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

—— ۱ ——

عَنْ قَيْسٍ، قَالَ: قَامَ أَبُوْ بَكْرٍ، فَحَمِدَ اللّٰهَ وَأَثْنٰى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّكُمْ تَقْرَءُوْنَ هٰذِهِ الْآيَةَ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ،[۲] [قَالَ: إِنَّ النَّاسَ يَضَعُوْنَ هٰذِهِ الْآيَةَ عَلٰى غَيْرِ مَوْضِعِهَا][۳]، وَإِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُوْلُ: ”إِنَّ النَّاسَ إِذَا رَأَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ يَأْخُذُوْا عَلٰى يَدَيْهِ، [وَالْمُنْكَرَ فَلَمْ يُغَيِّرُوْهُ][۴] أَوْشَكَ أَنْ يَعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابِهِ“.

قیس سے روایت ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ خطبے کے لیے کھڑے ہوئے، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی، پھر فرمایا: لوگو، تم اِس آیت کی تلاوت کرتے ہو کہ ”ایمان والو، تم اپنی فکر کرو، تم راہ ہدایت پر ہو تو جنھوں نے گم راہی اختیار کر لی ہے، وہ تمھارا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ تم سب کو اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے،

پھر وہ تمھیں بتا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو‘‘۔ فرمایا: لوگ اِس آیت کو غلط جگہ پر رکھ کر اِس کا مدعا بیان کرتے ہیں[1]۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب لوگ ظالموں کو دیکھیں اور اُن کا ہاتھ نہ پکڑیں اور منکرات کو دیکھیں اور اُن کے ازالے کی کوشش نہ کریں[2] تو اندیشہ ہے کہ اللہ سب کو سزا کے لیے پکڑ لے گا[3]۔

۱۔ مطلب یہ ہے کہ آیت کا محل تو مسلمانوں کے لیے اِس تسلی کا ہے کہ حق پہنچانے اور حق نصیحت ادا کر دینے سے زیادہ اُن کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اُن کے مخاطبین نہیں مانتے تو اِس پر وہ مسئول نہیں ٹھیرائے جائیں گے، مگر لوگ اِسے دعوت و تبلیغ، تعلیم و تلقین اور نہی عن المنکر ہی سے سبک دوشی کے معنی میں لے رہے ہیں، جو کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

۲۔ یعنی اپنے دائرۂ اختیار اور اپنی استطاعت کے لحاظ سے روکنے اور اُس کی جگہ خیر و صلاح پیدا کر دینے کی کوشش نہ کریں۔

۳۔ یعنی اُن کو بھی جو ظلم و عدوان اور منکرات کے مرتکب ہو رہے تھے، اور اُن کو بھی جو اُنھیں روکنے کے بجائے اُن سے بے پروا ہو کر بیٹھے رہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن مسند احمد، رقم ۳۰ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔ اُن سے یہ روایت درج ذیل مصادر میں نقل ہوئی ہے۔

مسند احمد، رقم ۲۹۔ سنن ترمذی، رقم ۲۰۹۴، ۳۰۰۲۔ سنن ابی داؤد، رقم ۴۳۳۸۔ صحیح ابن حبان، رقم ۳۰۸۔ مسند حمیدی، رقم ۳۔ مسند بزار، رقم ۵۳، ۵۴، ۱۱۵۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۱۲۱، ۱۲۴۔ مسند عبد بن حمید، رقم ۱۔ مشکل الآثار، طحاوی، رقم ۹۹۱، ۹۹۴۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۸۵۷۷۔

۲۔ المائدہ ۵: ۱۰۵۔

۳۔ صحیح ابن حبان، رقم ۳۰۸۔

۴۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۱۲۴۔

۲

حَدَّثَنِي أَبُو أُمَيَّةَ الشَّعْبَانِيُّ، قَالَ: سَأَلْتُ أَبَا ثَعْلَبَةَ الْخُشَنِيَّ[1]، فَقُلْتُ: يَا أَبَا ثَعْلَبَةَ، كَيْفَ تَقُولُ فِي هٰذِهِ الْآيَةِ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ؟ قَالَ: أَمَا وَاللّٰهِ لَقَدْ سَأَلْتَ عَنْهَا خَبِيْرًا، سَأَلْتُ عَنْهَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: ”بَلِ ائْتَمِرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنَاهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ حَتّٰى إِذَا رَأَيْتَ شُحًّا مُطَاعًا وَهَوًى مُتَّبَعًا وَدُنْيَا مُؤْثَرَةً وَإِعْجَابَ كُلِّ ذِي رَأْيٍ بِرَأْيِهِ، فَعَلَيْكَ يَعْنِي بِنَفْسِكَ وَدَعْ عَنْكَ الْعَوَامَّ، فَإِنَّ مِنْ وَرَائِكُمْ أَيَّامَ الصَّبْرِ، الصَّبْرُ فِيْهِ مِثْلُ قَبْضٍ عَلَى الْجَمْرِ، لِلْعَامِلِ فِيْهِنَّ مِثْلُ أَجْرِ خَمْسِيْنَ رَجُلًا يَعْمَلُوْنَ مِثْلَ عَمَلِكُمْ“.

ابوامیہ شعبانی کہتے ہیں کہ میں ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اُن سے پوچھا کہ اِس آیت کے بارے میں آپ کی کیا راے ہے: ”ایمان والو، تم اپنی فکر کرو، تم راہ ہدایت پر ہو تو جنھوں نے گم راہی اختیار کر لی ہے، وہ تمھارا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ تم سب کو اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو“؟ اُنھوں نے کہا: خدا کی قسم، تم نے اِس کے بارے میں ایک جاننے والے ہی سے پوچھا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اِس کے متعلق سوال کیا تھا تو آپ نے فرمایا: نہیں، بلکہ تم اچھی باتوں کی تلقین کرو، اور بری باتوں سے روکو اور اپنی یہ ذمہ داری پوری کرتے رہو، یہاں تک کہ جب دیکھ لو کہ لوگوں نے اپنی لگام حرص کے ہاتھ میں دے دی ہے اور خواہشات کی پیروی کی جا رہی ہے اور دنیا ترجیح پا چکی ہے اور ہر راے رکھنے والا اپنی ہی راے پر نازاں ہے تو اُس وقت، البتہ اپنی ذات کی فکر کرو اور عوام سے دور رہو[1]، اِس لیے کہ تمھارے آگے پھر

صبر کے دن ہیں،[۲] جن میں صبر ایسا ہی مشکل ہوگا، جیسے ہاتھ میں انگارا پکڑ لیا جائے۔ اُن میں عمل کرنے والے کے لیے وہی اجر ہے جو تمھارے پچاس عمل کرنے والوں کو[۳] ملے گا۔

۱۔ یعنی آیت کا مدعا وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو کہ لوگوں کے خیر وشر سے بے نیاز ہو کر بس اپنی ہی فکر کرنی چاہیے، ہرگز نہیں۔ اُنھیں ہر حال میں نیکی کی طرف بلانا اور برائی سے روکنا چاہیے۔ یہ ذمہ داری اُسی وقت ختم ہوتی ہے، جب بگاڑ اِس حد تک بڑھ جائے کہ کسی سے کچھ کہنے سننے کی گنجایش ہی باقی نہ رہے۔ اُس وقت، البتہ لوگوں کو اُن کے حال پر چھوڑ کر اپنی فکر کرنی چاہیے، ورنہ اندیشہ ہے کہ فساد پیدا ہوگا یا آدمی بتدریج خود بھی اُنھی کا رنگ ڈھنگ اختیار کر لے گا۔

۲۔ یعنی اِس امتحان کے دن ہیں کہ آدمی نیکی اور خیر پر ثابت قدم بھی رہے اور اپنے گرد وپیش میں بگاڑ کو دیکھ کر کوئی ایسا اقدام بھی نہ کرے جو معاشرے میں فساد پیدا کر دینے کا باعث ہو سکتا ہو۔

۳۔ یعنی زمانۂ رسالت کے مسلمانوں میں سے پچاس عمل کرنے والوں کو۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن صحیح ابن حبان، رقم ۳۷۸۰ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی ابوثعلبہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ اُن سے یہ روایت درج ذیل کتابوں میں نقل ہوئی ہے:

سنن ترمذی، رقم ۳۰۰۳۔ سنن ابوداؤد، رقم ۳۷۸۰۔ سنن ابن ماجہ، رقم ۴۰۱۲۔ مشکل الآثار، طحاوی، رقم ۹۹۵۔ مستدرک حاکم، رقم ۷۹۸۶۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۸۵۷۹۔ المعجم الکبیر، طبرانی رقم ۱۸۰۲۶۔

ـــــ ۳ ـــــ

عَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ قَالَ: أَوَّلُ مَنْ بَدَأَ بِالْخُطْبَةِ يَوْمَ الْعِيدِ، قَبْلَ الصَّلَاةِ، مَرْوَانُ، فَقَامَ إِلَيْهِ رَجُلٌ، فَقَالَ: الصَّلَاةُ قَبْلَ الْخُطْبَةِ، فَقَالَ: قَدْ تُرِكَ مَا هُنَالِكَ، فَقَالَ أَبُوْ سَعِيْدٍ:[۱] أَمَّا هٰذَا فَقَدْ قَضَى مَا عَلَيْهِ، سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: ”مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ[۲] فَبِلِسَانِهِ،

فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ".

طارق بن شہاب سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: سب سے پہلے جس شخص نے عید کے دن نماز سے پہلے خطبہ شروع کیا، وہ مروان تھا۔ اُس وقت ایک شخص کھڑا ہوا اور اُس نے کہا: خطبہ سے پہلے نماز پڑھی جائے گی، اِس پر مروان نے جواب دیا: اب وہ طریقہ ترک کر دیا گیا ہے جو اِس موقع کے لیے مقرر تھا۔ ابوسعید رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھا تو کہا: اِس شخص نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی[1]۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص برائی دیکھے[2] تو اُسے چاہیے کہ ہاتھ سے اُس کا ازالہ کرے۔ پھر اگر اِس کی ہمت نہ ہو تو زبان سے، اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو دل سے اُسے ناگوار سمجھے اور یہ ایمان کا ادنیٰ ترین درجہ ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے دائرۂ اختیار سے باہر یہ اِسی کا مکلّف تھا کہ حق بات کہہ دے، اِس سے زیادہ اِس کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ چنانچہ جو ممکن تھا اور جس کے لیے کوئی شخص اللہ کے ہاں جواب دہ ہو سکتا تھا، وہ کام اِس شخص نے کر دیا ہے۔

۲۔ یعنی اپنے دائرۂ اختیار میں کوئی برائی دیکھے۔ آگے درجات کا بیان دلالت کر رہا ہے کہ روایت کا حکم اُسی دائرے سے متعلق ہے جس میں کوئی شخص برائی کو ہاتھ سے روک دینے کا مکلّف ٹھیرایا جا سکتا ہے، ورنہ یہ کہنے کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ وہ اگر ایسا نہ کر سکا تو ایمان کے دوسرے، تیسرے یا ادنیٰ ترین درجے میں چلا جائے گا۔ یہ بات اُسی صورت میں کہی جا سکتی ہے، جب کہ وہ حکم کا مکلّف ہو اور محض ہمت اور حوصلے کی کمی اُس پر عمل نہ کرنے کا باعث بن جائے۔ روایت میں 'فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ' کا ترجمہ ہم نے اِسی بنا پر 'ہمت نہ ہو' کے الفاظ میں کیا اور اِس طرح واضح کر دیا ہے کہ استطاعت سے مراد یہاں وہ استطاعت نہیں ہے جس سے آدمی کسی کام کا مکلّف ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک اُسی اصول کا اطلاق ہے جس کی صراحت اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت کے بارے میں خود فرمائی ہے کہ 'لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا' (اللہ تعالیٰ کسی پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا)۔ چنانچہ یہی اصول ہے، جس کی بنا پر کسی پیغمبر کو بھی اِس کی اجازت نہیں دی گئی کہ برائی کو دیکھ کر وہ تذکیر و نصیحت سے آگے کسی کے خلاف کوئی اقدام کرے۔ ارشاد

فرمایا ہے:

اِنَّمَآ اَنۡتَ مُذَکِّرٌ، لَسۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِمُصَیۡطِرٍ. ’’(اے پیغمبر)، تم یاددہانی کرنے والے ہی ہو، تم اِن پر کوئی داروغہ نہیں ہو۔‘‘ (الغاشیہ ۸۸: ۲۱-۲۲)

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن صحیح مسلم، رقم ۷۸ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں۔ اُن سے یہ روایت درج مصادر میں نقل ہوئی ہے:

مسند احمد، رقم ۱۱۲۸۰، ۱۱۶۵۹۔ مسند عبد بن حمید، رقم ۹۱۴۔ سنن ترمذی، رقم ۲۰۹۸۔ سنن ابو داؤد، رقم ۹۶۵، ۳۷۷۹۔ سنن ابن ماجہ، رقم ۱۲۶۵، ۴۰۱۱۔ السنن الصغریٰ، نسائی، رقم ۴۹۴۸، ۴۹۴۹۔ مسند ابی یعلیٰ، رقم ۹۹۶، ۱۱۹۰۔ مستخرج ابی عوانہ، رقم ۸۰۔ صحیح ابن حبان، رقم ۳۱۰، ۳۱۱۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۲۳، ۵۷۲۳، ۱۳۴۶۸۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۲۳، ۵۷۲۳، ۱۳۴۶۸، ۱۸۵۶۹۔

۲۔ مصنف عبد الرزاق، رقم ۵۶۹۲ میں اِس جگہ ’فَلۡیَفۡعَلۡ‘ ’’اُسے چاہیے کہ روکے‘‘ کا اضافہ نقل ہوا ہے۔ السنن الصغریٰ، نسائی، رقم ۴۹۴۹ میں منکر کو روکنے کی اِن تینوں حالتوں کے بعد ’فَقَدۡ بَرِئَ‘ نقل ہوا ہے، یعنی (اگر اُس نے ایسا کیا) تو وہ اپنی ذمہ داری سے بری ہو گیا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

— ۴ —

عَنۡ عَبۡدِ اللّٰهِ بۡنِ مَسۡعُوۡدٍ،[۱] أَنَّ رَسُوۡلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ”مَا مِنۡ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيۡ أُمَّةٍ قَبۡلِيۡ، إِلَّا كَانَ لَهُ مِنۡ أُمَّتِهِ حَوَارِيُّوۡنَ، وَأَصۡحَابٌ يَأۡخُذُوۡنَ بِسُنَّتِهِ وَيَقۡتَدُوۡنَ بِأَمۡرِهِ، ثُمَّ إِنَّهَا تَخۡلُفُ مِنۡ بَعۡدِهِمۡ خُلُوۡفٌ، يَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا يَفۡعَلُوۡنَ، وَيَفۡعَلُوۡنَ مَا لَا يُؤۡمَرُوۡنَ، فَمَنۡ جَاهَدَهُمۡ بِيَدِهِ فَهُوَ مُؤۡمِنٌ، وَمَنۡ جَاهَدَهُمۡ بِلِسَانِهِ فَهُوَ مُؤۡمِنٌ، وَمَنۡ جَاهَدَهُمۡ بِقَلۡبِهِ فَهُوَ مُؤۡمِنٌ، وَلَيۡسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الۡإِيۡمَانِ، حَبَّةُ خَرۡدَلٍ“.

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے کوئی ایسا نبی نہیں بھیجا کہ جس کی امت میں اُس کے ایسے شاگرد اور ساتھی نہ ہوں جو اُس کے طریقے پر چلتے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے ہوں۔ پھر اِن لوگوں کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو زبان سے کہیں گے اور کریں گے نہیں، بلکہ وہ کچھ کریں گے، جس کا حکم اُنھیں نہیں دیا گیا۔ پھر جو ہاتھ سے اُن کا مقابلہ کرے، وہ مومن ہے۔ اور جو زبان سے کرے، وہ بھی مومن ہے۔ اور جو دل میں برا جانے، وہ بھی مومن ہے۔ اِس کے بعد، البتہ رائی کے دانے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔[1]

۱۔ یہ وہی مضمون ہے جس کی وضاحت ہم نے اوپر تفصیل کے ساتھ کر دی ہے۔ سن رشد کو پہنچنے کے بعد اللہ کا قانون یہی ہے کہ آدمی کسی عورت کا شوہر اور اِس کے نتیجے میں بچوں کا باپ بنے۔ بنی آدم کی یہ دونوں حیثیتیں دین و فطرت کی رو سے اُن کا ایک دائرۂ اختیار پیدا کرتی ہیں۔ ایمان کا یہ تقاضا کہ برائی کو ہاتھ سے روک دیا جائے، اِسی دائرے سے متعلق ہے۔ اِس دائرے سے باہر اگر اِس طرح کا کوئی اقدام کیا جائے گا تو یہ جہاد نہیں، بلکہ بدترین فساد ہوگا، جس کے لیے دین میں ہرگز کوئی گنجایش ثابت نہیں کی جا سکتی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

متن کے حواشی

۱۔ اِس روایت کا متن صحیح مسلم، رقم ۴۷ سے لیا گیا ہے۔ اِس کے راوی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں، اُن سے یہ روایت درج ذیل کتابوں میں نقل ہوئی ہے۔

مسند احمد، رقم ۴۲۲۸، ۴۲۵۵۔ صحیح ابن حبان، رقم ۶۳۲۷۔ مستخرج ابی عوانہ، رقم ۸۱، ۸۲۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۸۵۶۸۔ المعجم الاوسط، طبرانی، رقم ۹۳۴۰۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۹۶۶۹۔

المصادر والمراجع

ابن حبان، أبو حاتم بن حبان. (١٤١٤هـ/١٩٩٣م). **صحيح ابن حبان**. ط٢. تحقيق: شعيب الأرنؤوط. بيروت: مؤسسة الرسالة.

ابن حجر، علی بن حجر أبو الفضل العسقلاني. (١٣٧٩هـ). **فتح الباري شرح صحيح البخاري.** (د.ط). تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار المعرفة.

ابن قانع. (١٤٨١هـ/١٩٩٨م). **المعجم الصحابة.** ط١. تحقيق:حمدي محمد. مكة مكرمة: نزار مصطفٰى الباز.

ابن ماجة، ابن ماجة القزويني. (د.ت). **سنن ابن ماجة.** ط١. تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار الفكر.

ابن منظور، محمد بن مكرم بن الأفريقي. (د.ت). **لسان العرب.** ط١. بيروت: دار صادر.

أبو نعيم ، (د.ت). **معرفة الصحابه.** ط١. تحقيق: مسعد السعدني. بيروت: دارالكتاب العلمية.

أحمد بن محمد بن حنبل الشيباني. (د.ت). **مسند أحمد بن حنبل.** ط١. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

البخاري، محمد بن إسماعيل. (١٤٠٧هـ/ ١٩٨٧م). **الجامع الصحيح.** ط٣. تحقيق: مصطفٰى ديب البغا. بيروت: دار ابن كثير.

بدر الدين العيني. **عمدة القاري شرح صحيح البخاري.** (د.ط). بيروت: دار إحياء التراث العربي.

البيهقي، أحمد بن الحسين البيهقي. (١٤١٤هـ/١٩٩٤م). **السنن الكبرٰى.** ط١. تحقيق: محمد عبد القادر عطاء. مكة المكرمة: مكتبة دار الباز.

السيوطي، جلال الدين السيوطي. (١٤١٦هـ / ١٩٩٦م). **الديباج على صحيح مسلم بن الحجاج.** ط ١. تحقيق: أبو إسحٰق الحويني الأثري. السعودية: دار ابن عفان للنشر والتوزيع.

الشاشي، الهيثم بن كليب. (١٤١٠هـ). **مسند الشاشي.** ط١. تحقيق: محفوظ الرحمٰن زين الله. المدينة المنورة: مكتبة العلوم والحكم.

محمد القضاعي الكلبي المزي. (١٤٠٠هـ/١٩٨٠م). **تهذيب الكمال في أسماء الرجال.** ط١. تحقيق: بشار عواد معروف. بيروت: مؤسسة الرسالة.

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مسلم، مسلم بن الحجاج. (د.ت). **صحيح المسلم**. ط١. تحقيق: محمد فؤاد عبد الباقي. بيروت: دار إحياء التراث العربي.

النسائي، أحمد بن شعيب. (١٤٠٦هـ/١٩٨٦م). **السنن الصغرىٰ**. ط٢. تحقيق: عبد الفتاح أبو غدة. حلب: مكتب المطبوعات الإسلامية.

النسائي، أحمد بن شعيب. (١٤١١هـ/١٩٩١م). **السنن الكبرىٰ**. ط١. تحقيق: عبد الغفار سليمان البنداري، سيد كسروي حسن. بيروت: دار الكتب العلمية.

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد وسیم اختر مفتی

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا

(۱۱)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

آداب زندگی

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ کسی بھی مجلس سے اٹھنے سے پہلے دعا فرماتے: ’سبحٰنك اللّٰهم ربي و بحمدك لا إله إلا أنت، أستغفرك و أتوب إليك‘، ’’پاک ہے تو اے اللہ، میرے رب، تیری حمد ہی سے (شروع اور ختم کرتا ہوں)، تیرے سوا کوئی معبود نہیں، میں تمھاری بخشش کا طالب ہوں اور تیری طرف رجوع کرتا ہوں‘‘۔ میں نے پوچھا: یارسول اللہ، آپ نشست برخاست ہونے پر عام طور پر یہی کلمات کیوں ادا فرماتے ہیں؟ ارشاد کیا: جو بھی مجلس سے اٹھنے سے پہلے یہ کلمات کہتا ہے، اس مجلس میں اس سے سرزد ہوئے گناہ معاف ہو جاتے ہیں (مستدرک حاکم، رقم ۱۸۲۷۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۴۴۴۵)۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی سہل معاملہ پیش آتا تو فرماتے: ’الحمد لله بنعمته تتم الصالحات‘، ’’شکر ہے اس اللہ کا جس کی عنایت سے بھلائیوں کی تکمیل ہوتی ہے‘‘۔ جب ناگوار امر لاحق ہوتا تو فرماتے: ’الحمد لله علی کل حال‘، شکر ہے اللہ کا ہر حالت میں (مستدرک حاکم، رقم ۱۸۴۰)۔

حضرت عائشہ نے استفسار کیا: یارسول اللہ، میرے دو ہم سایے ہیں، ہدیہ کس کو بھیجوں؟ فرمایا: جس کا دروازہ تمھارے دروازے کے قریب ہے (بخاری، رقم ۲۲۵۹۔ ابوداؤد، رقم ۵۱۵۵۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۴۲۳۔

مستدرک حاکم، رقم ۷۳۰۹)۔

حضرت عائشہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے (ان) متعدد مسکینوں کی گنتی کی (جنھیں صدقات دیے گئے)۔ آپ نے فرمایا: صدقہ دے دو اور شمار نہ کرو، کہیں تمھارا رزق نہ شمار کر لیا جائے (ابوداؤد، رقم ۱۷۰۰)۔ ایک بار حضرت عائشہ نے ایک سوالی کو کچھ دیا، لیکن پھر اسے بلا کر تحقیق کی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پاس بیٹھے تھے، فرمایا: تو چاہتی ہے کہ گھر میں آنے جانے والی ہر شے تمھارے علم میں رہے؟ جواب دیا: ہاں۔ فرمایا: ٹھیرو، عائشہ، گن گن کر نہ دو، کہیں اللہ تمھیں گن گن کر نہ دینے لگے (نسائی، رقم ۲۵۵۰۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۴۱۸)۔

حضرت عائشہ اہل صفہ کے لیے کچھ نہ کچھ صدقہ بھیجا کرتی تھیں۔ کہتیں: ان میں کسی بربری مرد یا عورت کو نہ دینا، کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، یہ وہ ناخلف ہیں جن کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہے: 'فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ'،''ان کے بعد وہ ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جنھوں نے نماز ضائع کر دی'' (مریم ۱۹: ۵۹)۔ (مستدرک حاکم، رقم ۲۹۶۳)۔

حضرت عائشہ نے سوال کیا: یا رسول اللہ، وہ کون سی شے ہے جس سے انکار کرنا جائز نہیں۔ فرمایا: پانی، نمک اور آگ۔ کہا: یا رسول اللہ، پانی کی بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ نمک اور آگ کا کیا معاملہ ہے؟ آپ نے جواب فرمایا: حمیرا، جس نے آگ دے دی، گویا اس نے آگ سے پکانے والی ہر شے دے دی۔ جس نے نمک دیا، گویا اس نے نمک کا ذائقہ رکھنے والی تمام اشیا دیں۔ جس نے کسی مسلمان کو پانی پلایا، ایسی جگہ پر جہاں پانی موجود تھا، گویا اس نے ایک غلام آزاد کیا اور جس نے مسلمان کو پانی پلایا، ایسی جگہ جہاں پانی موجود ہی نہ تھا، گویا اس نے اسے زندگی بخشی (ابن ماجہ، رقم ۲۴۷۴)۔

ایک سوالی حضرت عائشہ کے پاس آیا۔ انھوں نے اسے روٹی کا ایک ٹکڑا دے دیا۔ پھر ایک آدمی گزرا جس کی ہیئت اور لباس اچھا تھا۔ انھوں نے اسے بٹھا لیا۔ وہ کھانا کھا کر رخصت ہوا تو معترض نے پوچھا: یہ فرق کیوں؟ کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: لوگوں کی تواضع ان کے مرتبے کے مطابق کرو (ابوداؤد، رقم ۴۸۴۲)۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گوہ کا گوشت آیا تو آپ نے نہ کھایا، حضرت عائشہ نے کہا: ہم اسے مسکینوں کو نہ کھلا دیں۔ آپ نے فرمایا: انھیں وہ شے نہ کھلاؤ جو تم خود نہیں کھاتے (موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۱۱۰۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۹۴۲۶)۔ محدثین نے روایت کے دوسرے جملے کو غیر صحیح قرار دیا ہے۔

عبداللہ بن عامر نے حضرت عائشہ کو کچھ نقدی اور کپڑے بھیجے۔ انھوں نے کہا: بچے، میں کسی سے تحفہ قبول نہیں

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کرتی۔ جب ہدیہ لانے والا واپس ہونے لگا تو کہا: لے آؤ، واپس لے آؤ۔ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بات یاد آ گئی ہے۔ آپ نے فرمایا تھا: عائشہ، جب کوئی بغیر مانگے تمھیں کچھ دے تو قبول کر لو۔ اصل میں یہ رزق ہے جو اللہ نے تمھیں بھیجا ہے (موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۴۸۰)۔

حضرت عائشہ سے سوال کیا گیا: کیا اپنی پرورش میں رہے ہوئے یتیم کی کمائی کھائی جا سکتی ہے؟ انھوں نے جواب دیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: انسان کی سب سے عمدہ روزی اس کی اپنی محنت کی کمائی ہے اور اس کی اولاد بھی اس کی محنت کا ثمر ہے (ابوداؤد، رقم ۳۵۲۸۔ نسائی، رقم ۴۴۵۴۔ ابن ماجہ، رقم ۲۱۳۷۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۰۳۲۔ مستدرک حاکم، رقم ۲۲۹۴)۔

نافع کہتے ہیں: میں سامان تجارت شام اور مصر کو بھیجا کرتا تھا۔ ایک بار میں نے عراق لے جانے کا ارادہ کیا، حضرت عائشہ کو بتانے آیا تو انھوں نے کہا: ایسا نہ کرو، تمھاری پہلی منڈی کا کیا ہوا؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے، جب اللہ نے کسی جگہ تمھارے رزق کا سبب بنایا ہو تو اسے نہ چھوڑو جب تک اس میں کوئی تغیر یا خرابی پیدا نہ ہو (ابن ماجہ، رقم ۲۱۴۸۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۶۰۹۲)۔ اس روایت کو ضعیف بتایا گیا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: بریرہ کی زندگی سے تین سنتیں یا شرعی احکام معلوم ہوئے: (۱) آزاد کیے جانے کے بعد اسے اپنے خاوند کے نکاح میں رہنے یا نہ رہنے کی آزادی دی گئی۔ (۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قضیے میں یہ فیصلہ فرمایا، حق وراثت (موالات) اسی کا ہے جو آزاد کرتا ہے۔ (۳) آپ گھر تشریف لائے تو آگ پر ہنڈیا دھری تھی۔ آپ کو روٹی اور گھر کا سالن پیش کیا گیا تو دریافت فرمایا: کیا بات ہے ہنڈیا والا سالن نظر نہیں آ رہا؟ بتایا گیا، اس میں بریرہ کو ملنے والا صدقے کا گوشت ہے جو آپ نہیں کھاتے۔ فرمایا: وہ اس کے لیے صدقہ اور ہمارے لیے ہدیہ ہے (بخاری، رقم ۵۰۹۷۔ مسلم، رقم ۳۷۷۴۔ نسائی، رقم ۳۴۷۷۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۱۸۷)۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں: اگر بریرہ کا خاوند مغیث آزاد ہوتا تو آپ اسے خاوند چھوڑنے کا اختیار نہ دیتے (ابوداؤد، رقم ۲۲۳۳۔ ترمذی، رقم ۱۱۵۴)۔

حضرت عائشہ کے ایک رشتہ دار پر نزع کا عالم طاری تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور انھیں تسلی دی، نزع کی سختی پر رنجیدہ نہ ہو۔ جانے والے کی نیکیاں ہی اس کا سبب ہیں (ابن ماجہ، رقم ۱۴۵۱)۔ یعنی اس وقت کی تکلیف سے رہے سہے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

ام المومنین حضرت ام حبیبہ نے وفات (۴۴ھ) کے وقت حضرت عائشہ کو بلایا اور کہا: اللہ سے دعا ہے کہ ہمارے

مابین رہنے والی سوتنوں والی خلش کو معاف فرمائے۔ میں نے آپ کی تمام باتوں سے درگذر کر لیا ہے۔ حضرت عائشہ نے جواب دیا: آپ نے مجھے خوش کر دیا ہے۔ اللہ آپ کو خوش کرے۔ پھر حضرت ام حبیبہ اور ام المومنین حضرت ام سلمہ کے درمیان بھی ایسا ہی مکالمہ ہوا (مستدرک حاکم، رقم ۶۷۷۳)۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: ایک عورت کسی کافر کو اہل ایمان کی جانب سے پناہ دے تو وہ جائز اور نافذ ہو گی (ابوداؤد، رقم ۲۷۶۴)۔ جیسا کہ حضرت ام ہانی نے فتح مکہ کے موقع پر ایک مشرک کو پناہ دی تو آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے جسے پناہ دی، ہم نے بھی اسے امان دیا (ابوداؤد، رقم ۲۷۶۳)۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: اس امت نے اللہ کے اس فرمان سے جیسی بے پروائی برتی ہے، میں نے کسی اور معاملے میں نہیں دیکھی: 'وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ'، ''اگر اہل ایمان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ۔ اگر ایک فریق دوسرے پر زیادتی کر رہا ہو تو اس زیادتی کرنے والے سے قتال کرو، حتیٰ کہ وہ اللہ کے فیصلے کی طرف لوٹ آئے'' (الحجرات ۴۹: ۹)۔ (مستدرک حاکم، رقم ۲۶۶۴۔ السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم ۱۶۷۰۷)۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہلیہ کے پاس ایک مخنث آیا کرتا تھا۔ لوگ اسے ان مردوں میں شمار کرتے تھے جن کا جنس مخالف کی طرف میلان نہیں ہوتا۔ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو وہ کسی عورت کی برائی کر رہا تھا کہ جب وہ آگے جاتی ہے تو موٹاپے کی وجہ سے اس کے پیٹ پر چار بل پڑتے ہیں اور واپس مڑتی ہے تو یہ بل آٹھ ہو جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ جانتا ہے کہ پیٹ میں کیا ہوتا ہے، تمھارے پاس ہرگز نہ آئے چنانچہ ازواج مطہرات نے اس سے پردہ کرنا شروع کر دیا (مسلم، رقم ۵۷۴۲۔ ابوداؤد، رقم ۴۱۰۷۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۱۸۵)۔

ارشاد ربانی ہے: 'لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ'، ''اللہ تمھاری بے معنی قسموں پر تم سے پوچھ گچھ نہ کرے گا، مگر وہ ان قسموں کی ضرور تم سے باز پرس کرے گا جو تم سچے دل سے کھاتے ہو، اور اللہ بہت درگذر کرنے والا اور تحمل والا ہے'' (البقرہ ۲: ۲۲۵)۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: اس فرمان کا اطلاق لوگوں کے اس طرح کے اقوال 'لا، و اللّٰہ!' نہیں، اللہ کی قسم! 'بلی، و اللّٰہ!' کیوں نہیں، اللہ قسم! پر ہوتا ہے (بخاری، رقم ۶۶۶۳)۔ کئی لوگ قسموں کو تکیہ کلام بنا لیتے ہیں، کچھ لوگ کھیل کود یا لڑائی جھگڑے میں قسموں کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں چھوٹ عطا کی، تاہم

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ایک مومن کو دوسرے لایعنی کاموں کی طرح لغو قسموں سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم برے مفہوم کے حامل انسانی ناموں کو بدل دیا کرتے تھے (ترمذی، رقم ۲۸۳۹)۔ جیسے آپ نے عاصیہ (مفہوم: گناہ گار) کو جمیلہ (مطلب: خوب صورت) سے تبدیل فرمایا (ترمذی، رقم ۲۸۳۸)۔ آپ کا اپنے نواسے حرب (جنگ) کا نام حسن (خوب صورت) سے بدلنا بھی اس کی مثال ہے۔ حضرت خدیجہ کے زمانے میں آنے والی عورت حضرت جثامہ (کند ذہن) مزنیہ آپ سے ملنے آئیں تو آپ نے ان کا نام حسانہ (انتہائی خوب صورت) مزنیہ کر دیا (مستدرک حاکم، رقم ۴۰)۔

حضرت عائشہ کا لحاف (یا گلو بند) چوری ہو گیا تو وہ چور کو بد دعا دینے لگیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بد دعا دے کر اس کے گناہ و عذاب میں تخفیف نہ کرو (ابوداؤد، رقم ۱۴۹۷۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۷۹۸)۔

حضرت عائشہ کہتی ہیں: میں نے کسی کی نقل اتاری تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں کسی انسان کی نقل اتارنا پسند نہ کروں، چاہے اس کا کتنا ہی صلہ ملے (ابوداؤد، رقم ۴۸۷۵۔ ترمذی، رقم ۲۵۰۲۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۹۶۴)۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حضرت عائشہ اونٹ پر سوار، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شریک سفر تھیں۔ اثنائے سفر میں انھوں نے اونٹ پر لعنت بھیجی تو آپ نے وہ اونٹ واپس بھیجنے کا حکم دیا اور فرمایا: کوئی شے ملعون میرے ساتھ سفر نہ کرے (مسلم، رقم ۷۴۳۷۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۴۳۴)۔ مسلم کی روایت میں اونٹ کو لعنت ملامت کرنے والے کسی صحابی کا ذکر کیا گیا ہے جن کا نام نہیں بتایا گیا۔ انھیں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم ارشاد کیا۔

مسائل طہارت

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشاب پاخانے سے فارغ ہونے کے بعد پانی استعمال نہ کیا ہو (ابن ماجہ، رقم ۳۵۴)۔ پرانے زمانے میں مٹی کے ڈھیلوں سے استنجا کیا جاتا تھا، آج کل اس مقصد کے لیے ٹشو پیپر استعمال کیے جاتے ہیں، لیکن کامل طہارت پانی ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

حضرت حذیفہ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پیشاب کیا (بخاری، رقم ۲۲۴۔ نسائی، رقم ۲۶۔ ابن ماجہ، رقم ۳۰۶)۔ لیکن حضرت عائشہ اس کی سختی سے تردید کرتے ہوئے کہتی ہیں: ''جو شخص یہ کہتا ہے، اس کو سچا ہی نہ سمجھو۔ آپ ہمیشہ بیٹھ کر پیشاب کیا کرتے تھے (ترمذی، رقم ۱۲۔ نسائی، رقم ۲۹۔

ابن ماجہ، رقم ۳۰۷۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۰۴۵۔ مستدرک حاکم، رقم ۶۴۴)۔ امام نسائی نے کتاب طہارت کے جو عنوانات قائم کیے ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے، حضرت عائشہ کا مشاہدہ گھر کی حد تک تھا۔ لہٰذا ان کی تنقید درست تھی۔ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی اجازت محض صحرا میں استثنائی حالات تک محدود ہے۔

حضرت عائشہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل جنابت کا بیان اس طرح کیا، آپ پہلے دونوں ہاتھ دھوتے پھر برتن سے پانی لے کر شرم گاہ دھوتے اور نماز والا وضو کرتے، پھر انگلیوں سے بالوں کی جڑوں کو اچھی طرح تر کرتے، سر پر تین چلو بھر کر پانی ڈالتے اور پھر تمام جسم پر پانی بہا دیتے (بخاری، رقم ۲۴۸۔ مسلم، رقم ۶۴۴۔ ترمذی، رقم ۱۰۴۔ نسائی، رقم ۴۲۰۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۲۵۷)۔ حضرت میمونہ کی روایت میں ہے، پاؤں آپ آخر میں ذرا ہٹ کر یا غسل خانے سے باہر نکل کر دھوتے (بخاری، رقم ۲۴۹۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۳۷۰)۔ اس طرح غسل کر لینے کے بعد آپ وضو نہ کرتے (ترمذی، رقم ۱۰۷۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۳۸۹)۔ حضرت عائشہ کی اس روایت کی بنیاد پر امام ابو حنیفہ اور امام شافعی غسل سے پہلے وضو کو سنت قرار دیتے ہیں، امام مالک اسے مستحب سمجھتے ہیں۔ ابن حزم کی رائے ہے، ابتداے غسل جنابت میں وضو کرنا فرض ہے۔ انور شاہ کشمیری کہتے ہیں: اس وضو میں سر کا مسح کرنا ضروری ہو گا۔ پاؤں، البتہ حضرت میمونہ کی روایت پر عمل کرتے ہوئے غسل کے اختتام پر دھوئے جا سکتے ہیں۔ حضرت عائشہ کی ایک روایت میں نماز والے وضو کا نام نہیں لیا گیا۔ اس میں پہلے شرم گاہ اور ہاتھ دھونے پھر کلی کرنے، ناک میں پانی چڑھانے اور پھر سر اور جسم پر پانی بہانے کا ذکر ہے (نسائی، رقم ۲۴۴۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۲۸۳)۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

نخع کا ایک شخص حضرت عائشہ کے ہاں مہمان ہوا۔ انھوں نے اس کے سونے کے لیے ایک زرد چادر بھیجی۔ اسے احتلام ہو گیا تو چادر پانی سے دھو کر واپس کی۔ حضرت عائشہ نے کہا: ہماری چادر خراب کیوں کی؟ اسے انگلی سے کھرچ دینا کافی تھا۔ میں اکثر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں کے داغ انگلیوں سے رگڑ دیتی تھی (مسلم، رقم ۵۹۵۔ ترمذی، رقم ۱۱۶۔ ابن ماجہ، رقم ۵۳۸۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۱۵۸)۔ حضرت عائشہ ہی کی دوسری روایت میں دھونے کا ذکر ہے۔ فرماتی ہیں: ''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں سے اثر جنابت دھو دیتی تھی۔ آپ نماز پڑھانے کے لیے جاتے تو جگہ جگہ سے گیلا کپڑا نظر آ رہا ہوتا'' (بخاری، رقم ۲۲۹۔ مسلم، رقم ۵۹۴۔ ترمذی، رقم ۱۱۷۔ نسائی، رقم ۲۹۶۔ ابن ماجہ، رقم ۵۳۶)۔

عورتیں ڈبیا میں رطوبت حیض سے تر پھاہے ڈال کر حضرت عائشہ کے پاس بھیجتیں۔ اگر ان میں زردی ہوتی تو کہتیں: جلدی نہ کرو، حتیٰ کہ چونے جیسی سفیدی نمایاں ہو جائے (بخاری، کتاب الحیض، باب ۱۹)۔

ایک انصاریہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا، میں حیض سے پاکی کیسے حاصل کروں؟ آپ نے فرمایا: مشک میں بسا ہوا ایک کپڑا لے کر اس سے پاکی حاصل کرو (اور غسل مکمل کرلو)۔ پھر آپ نے شرما کر رخ مبارک پھیر لیا۔ سیدہ عائشہ نے اس عورت کو پکڑ کر کھینچ لیا اور بتایا کہ اس کپڑے کو جسم کے خون آلودہ حصوں پر پھیر لو (اور پورے جسم پر پانی بہالو) (بخاری، رقم ۳۱۴، ۳۱۵۔ نسائی، رقم ۴۲۷۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۹۰۷)۔ دوسری روایت کے مطابق آپ نے فرمایا: پہلے پانی اور بیری کے پتوں (آج کل صابن) سے (نیچے والا جسم) اچھی طرح دھوئے پھر سر پر پانی ڈالے اور خوب ملے یہاں تک کہ پانی بالوں کی جڑوں میں پہنچ جائے۔ پھر اپنے اوپر (تمام بدن پر) پانی ڈالے، پھر ایک مشک لگا ہوا پھاہا مل کر پاکی مکمل کرے (مسلم، رقم ۶۷۶۔ ابوداؤد، رقم ۳۱۴۔ ابن ماجہ، رقم ۶۴۲۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۱۴۵)۔

شام کے شہر حمص کی عورتیں حضرت عائشہ سے ملنے آئیں تو انھوں نے کہا: تم وہ عورتیں ہو جو حماموں میں جاتی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس عورت نے اپنے شوہر کے گھر کے علاوہ کہیں کپڑے اتارے، اس نے اپنے اور اپنے رب کے درمیان حائل پردہ اتار پھینکا (ترمذی، رقم ۲۸۰۳۔ ابن ماجہ، رقم ۳۷۵۰۔ مستدرک حاکم، رقم ۷۷۸۰)۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مردوں کو بھی حماموں میں جانے سے منع فرمایا تھا، پھر انھیں تہ بند پہن کر جانے کی اجازت دے دی (ابن ماجہ، رقم ۳۷۴۹۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۰۰۶)۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ممیّزات حضرت عائشہ

حضرت عائشہ ایک خصلت اپناتیں تو اس پر قائم رہتیں۔

حضرت عائشہ کے پاس قرآن مجید کا ایک قلمی نسخہ تھا جو انھوں نے اپنے غلام ابو یونس سے لکھوایا تھا۔

مسجد نبوی کا وہ گوشہ جو حضرت عائشہ کے حجرے سے متصل تھا، اپنے دور کی عظیم درس گاہ تھی۔ عورتیں، وہ لڑکے اور مرد جن کا حضرت عائشہ سے پردہ نہ تھا، حجرہ کے اندر آ کر بیٹھتے۔ دیگر حضرات پردے کے باہر ہوتے۔ سوالات و جوابات کا سلسلہ شروع ہوتا اور حضرت عائشہ بحث علمی کو سمیٹتیں۔ انھوں نے اپنے خاندان اور شہر کے جن یتیم بچوں کو پرورش میں لے رکھا تھا، اس کلیۂ علمی کے مستقل طالب علم تھے۔ وہ نامحرم جنھیں اندر جانے کی اجازت نہ ہوتی، شکوہ مند ہی رہتے کہ ہمیں حصول علم کا اچھی طرح موقع نہیں ملتا۔

حج کا موسم آتا تو جبل حرا اور کوہ ثبیر کے درمیان نصب حضرت عائشہ کا خیمہ حلقۂ درس بن جاتا۔ کبھی سیدہ بیت اللہ

میں چاہ زم زم کی چھت کے نیچے بیٹھ جاتیں اور تشنگان علم کا ہجوم ان کو گھیر لیتا۔

روایت حدیث میں حضرت عائشہ کا یہ خاصہ ہے کہ وہ احکام بتانے کے ساتھ ان کے اسباب و علل بھی بیان کرتی ہیں۔انھوں نے معاصرین کے مسامحات کی دارو گیر اور ان کی غلط فہمیوں کی اصلاح بھی کی۔محدثین کی اصطلاح میں اسے استدراک کہتے ہیں۔جلال الدین سیوطی نے ''عين الإصابة في ما استدركته عائشة على الصحابة'' میں ان استدراکات کو جمع کر دیا ہے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: ایک رات آل ابوبکر نے ہمیں بکری کا ایک پایہ بھیجا۔کبھی میں نے اس کو پکڑا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کاٹا اور کبھی آپ نے پکڑا اور میں نے چھری چلائی۔یہ سب اندھیرے میں بغیر چراغ کے ہوا۔ روشنی ہوتی تو ہم سالن بنا لیتے (موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۶۳۱)۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر بد کا دم کیا کرتی تھی۔اپنا ہاتھ آپ کے سینے پر رکھتی اور کہتی: 'امسح البأس رب الناس، بيدك الشفاء، لا كاشف له إلا أنت'، ''اے لوگوں کے رب، تکلیف زائل کر دے، تیرے ہاتھ میں شفا ہے، مصیبت کو تو ہی ٹالنے والا ہے'' (موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۹۹۵۔ السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۷۴۸۹)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عروہ بن زبیر نے حضرت عائشہ سے کہا: خالہ جان، مجھے آپ کے فہم و فراست پر اتنا تعجب ہوتا ہے نہ عربوں کے اشعار اور ان کے مشہور واقعات پر آپ کی معلومات پر اچنبھا ہوتا ہے، حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ آپ کے پاس علم طب کیسے آ گیا؟ حضرت عائشہ نے ان کے مونڈھے پر ہاتھ مار کر کہا: اوعریّہ، آخری عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار رہتے تھے۔عرب کے تمام اطراف سے وفود آپ کے پاس آتے اور اپنے اپنے نسخے تجویز کرتے۔میں ہی ان کے مطابق آپ کا علاج کیا کرتی تھی (موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۳۸۰۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۱۸۸۱۶۔ حلیۃ الاولیاء، رقم ۱۴۸۳۔ مستدرک حاکم، رقم ۷۴۲۶)۔

مدینہ کے قصہ گو ابن ابی سائب کو حضرت عائشہ نے تین نصیحتیں کیں: دعا میں قافیہ گوئی سے پرہیز کرو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ ایسا نہیں کرتے تھے۔ہر جمعہ کو ایک ہی بار قصہ گوئی کرنا، زیادہ سے زیادہ دو یا تین بار سنا سکتے ہو۔لوگوں کے پاس اس وقت نہ آنا جب وہ اپنی باتوں میں مشغول ہوں۔جب وہ تمھاری طرف متوجہ ہوں تو اپنی بات کرنا (موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۱۹۸۔ صحیح ابن حبان، رقم ۹۷۸)۔

ایک بار حضرت عائشہ نے خواب میں دیکھا کہ تین چاند ان کی گود میں آن پڑے ہیں۔ان کے والد حضرت

ابوبکر نے اس کی تعبیر یہ بتائی کہ روے زمین کے تین بہترین افراد ان کے حجرے میں مدفون ہوں گے۔آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی ابدی آرام گاہیں اس گھر میں بن گئیں تو یہ خواب سچا ہوا (مستدرک حاکم، رقم ۴۴۰۰)۔

حضرت عائشہ سے مروی چند دیگر وقائع و مسائل

حضرت عائشہ سے ان کے شاگرد ابن ابی ملیکہ نے جواز متعہ کی روایتوں کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے روایات سے تعرض کرنے کے بجاے یہ آیات تلاوت کیں: 'وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ. اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ'، ''(فلاح پا گئے وہ اہل ایمان) جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، ماسواے اپنی بیویوں اور مملوکہ عورتوں سے۔ ان پر کچھ ملامت نہ ہو گی'' (المومنون ۲۳: ۵-۶) اور کہا کہ قرآن کی رو سے ان دو جائز قسموں کے علاوہ کسی تیسری نوع کی گنجایش نہیں۔ متعہ کی جانے والی عورت بیوی ہے نہ باندی، اس لیے جائز نہیں (مستدرک حاکم، رقم ۳۴۸۴)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت عبداللہ بن زبیر فتویٰ دیتے تھے کہ عورت حج کرنے کے بعد چار انگل ناپ کر بال ترشوائے۔ حضرت عائشہ کو معلوم ہوا تو فرمایا: تم کو ابن زبیر کی بات پر تعجب نہیں ہوا۔ عورت کے لیے کسی طرف کا ذرا سا بال لے لینا بھی کافی ہے۔ سیوطی نے ''عين الإصابة في ما استدركته عائشة على الصحابة'' میں امام احمد بن حنبل کی تالیف ''مناسک کبیر'' یا ''کتاب المناسک'' کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے (سیرت عائشہ ۳۰۷)۔ کوشش بسیار کے باوجود ہماری اس کتاب تک رسائی نہ ہو سکی، تاہم ''موطا امام مالک'' کی شرح ''المنتقٰی'' (۴/ ۵۶) میں حضرت عائشہ کا یہ فتویٰ دیکھا کہ 'عورت کے لیے اپنے بالوں کے کنارے تراش لینا کافی ہے'۔

حضرت عائشہ نے فرمایا کہ حضرت عمار بن یاسر فطرت پر وفات پائیں گے، ماسوا اس کے بڑھاپے کی وجہ سے ان سے کوئی لغزش ہو جائے (مستدرک حاکم، رقم ۵۶۸۵)۔

مسلم بن صبیح حضرت عائشہ سے ملنے آئے تو ایک نابینا ان کے پاس بیٹھے تھے۔ وہ انھیں لیموں (یا چکوترا) کاٹ کر شہد کے ساتھ کھلا رہی تھیں۔ انھوں نے پوچھا: یہ کون ہیں؟ بتایا: یہ وہی ابن ام مکتوم ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو متوجہ کیا تھا: 'عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى. اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى'، ''نبی نے ناگواری کا اظہار کر کے (عتبہ اور شیبہ کی طرف) رخ پھیر لیا، اس بات پر کہ نابینا (ابن ام مکتوم) ان کے پاس

آ بیٹھا ہے'' (عبس ۸۰: ۱-۲)۔ (مستدرک حاکم، رقم ۲۷۶۱)۔

ایک عورت حضرت عائشہ کے کمرے میں داخل ہوئی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری آرام گاہ کے پاس نماز پڑھنے لگی۔ آتے وقت وہ بالکل تندرست تھی، لیکن سجدے میں گرتے ہی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ حضرت عائشہ ٹھٹکیں اور کہا: شکر ہے اس اللہ کا جو زندگی و موت دیتا ہے۔ مجھے اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن ابوبکر کی موت کے بارے میں نصیحت حاصل ہو گئی۔ وہ دوپہر کو قیلولہ کرتے ہوئے فوت ہو گیا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ لوگوں نے جلد بازی کی اور اسے زندہ ہی دفنا دیا (مستدرک حاکم، رقم ۶۰۱۱۔ تاریخ دمشق: ۳۵/ ۳۸)۔

حضرت عائشہ نے عروہ بن زبیر سے کہا: بھانجے، مجھے پتا چلا ہے کہ عبداللہ بن عمرو ہمارے پاس سے گزر کر حج کو جا رہے ہیں۔ ان سے ملو اور سوالات کرو، کیونکہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت علم سیکھ رکھا ہے۔ چنانچہ عروہ ان سے ملے اور ان سے ہونے والی گفتگو سے حضرت عائشہ کو مطلع کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو نے ایک حدیث یہ بیان کی کہ 'اللہ تعالیٰ لوگوں سے علم کلی طور پر سلب نہیں کرتا، بلکہ علما کو اٹھا لیتا ہے اور ان کے ساتھ علم بھی چلا جاتا ہے۔' حضرت عائشہ کو یقین نہ آیا اور پوچھا: کیا انھوں نے بتایا کہ میں نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع کی؟ اگلا برس ہوا تو حضرت عائشہ نے عروہ کو پھر ان کے پاس بھیجا۔ انھوں نے پہلی روایت پھر دہرا دی۔ اب حضرت عائشہ کو اطمینان ہوا اور فرمایا: عبداللہ نے سچ کہا اور کمی بیشی نہیں کی (مسلم، رقم ۶۸۹۶)۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ایک عورت نے حضرت عائشہ کو 'اے اماں' کہہ کر پکارا تو کہا: میں تمھاری ماں نہیں، بہن ہوں (موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۱۳۶)۔ اور تمھارے مردوں کی ماں ہوں۔

حضرت عائشہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ میں اپنے غلام میاں بیوی جوڑے کو آزاد کرنا چاہتی ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ عورت کو آزاد کرنے سے پہلے اس کے خاوند کو آزاد کرو (تاکہ عورت کو نکاح فسخ کرنے کا اختیار حاصل نہ ہو جائے) (ابوداؤد، رقم ۲۲۳۷۔ ابن ماجہ، رقم ۲۵۳۲۔ مستدرک حاکم، رقم ۲۸۲۷)۔

عبداللہ بن ابوملیکہ نے حضرت عائشہ کو قبرستان سے آتے دیکھا تو ان کے پوچھنے پر بتایا کہ میں اپنے عبدالرحمٰن بن ابوبکر کی قبر سے ہو کر آ رہی ہوں۔ عبداللہ نے کہا: کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زیارت قبور سے منع نہ فرمایا تھا؟ حضرت عائشہ نے جواب دیا: ہاں، آپ نے منع فرمایا تھا، پھر قبرستان جانے کی اجازت دے دی تھی (مستدرک حاکم، رقم ۱۳۹۲)۔

حضرت جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ کھجور اور انگور ملا کر نبیذ بنایا

جائے (ابوداؤد، رقم ۳۷۰۳)۔ امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور اہل حدیث علما اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے ایک سے زیادہ اجزا پر مشتمل نبیذ کو مطلقاً حرام سمجھتے ہیں، چاہے اس میں نشے کا شائبہ نہ ہو۔ انور شاہ کشمیری کہتے ہیں کہ یہ نہی سد ذریعہ کے لیے ہے۔ چونکہ دوسرے جزو کے ملنے سے مشروب کے مسکر ہونے کا احتمال بڑھ جاتا ہے، اس لیے خلیطین (mixture) سے منع کر دیا گیا۔ اس روایت کے برعکس حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ میں ایک مٹھی کھجور اور ایک مشت انگور چمڑے کے برتن میں ڈالتی، اس میں پانی ڈال کر ہاتھ سے ملتی، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پلاتی (ابوداؤد، رقم ۳۷۰۸۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۱۹۸)۔ حضرت عائشہ وضاحت کرتی ہیں کہ میں جو نبیذ صبح تیار کرتی، آپ شام کے کھانے کے بعد پیتے اور اگر بچ جاتا تو میں بہا دیتی یا ختم کر دیتی۔ جب نبیذ رات کو بنایا جاتا تو آپ ناشتے کے بعد پیتے۔ نبیذ کا مشکیزہ ہم دن میں دو بار دھوتے (ابوداؤد، رقم ۳۷۱۲۔ ترمذی، رقم ۱۸۷۱۔ ابن ماجہ، رقم ۳۳۹۸۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۹۳۰)۔ یہی نبیذ زیادہ دن پڑا رہے تو گاڑھا ہو کر جوش مارتا ہے اور چمڑے کو پھاڑ دیتا ہے۔ تب یہ نشہ آور ہو جاتا ہے اور اس کا پینا حرام ہو جاتا ہے۔ سفیان ثوری، امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف حضرت عائشہ کی روایت پر عمل کرتے ہوئے مرکب نبیذ کا پینا جائز سمجھتے ہیں، بشرطیکہ اس میں نشہ نہ ہو۔

حضرت عائشہ بچوں کے پھوڑوں، پھنسیوں کا علاج کرتی تھیں۔ ایک بچے کو دوا دینے کے بعد انھوں نے دیکھا کہ اسے (بغرض روحانی تاثیر) لوہے کی پازیبیں پہنائی گئی ہیں۔ حضرت عائشہ نے کہا: تم سمجھتے ہو کہ یہ پازیبیں اللہ کی لکھی ہوئی تکلیف دور کر دیتی ہیں۔ میں ان کو پہلے دیکھ لیتی تو تمھارا علاج ہی نہ کرتی۔ چاندی کی پازیبیں ان لوہے کی پازیبوں سے بہتر ہوتی ہیں، (کیونکہ انھیں پہناتے وقت کوئی غیر مرئی تاثیر مطلوب نہیں ہوتی۔ مستدرک حاکم، رقم ۷۵۰۸)۔ دوسری روایت میں ہے کہ ایک نومولود دعاے برکت کے لیے حضرت عائشہ کے پاس لایا گیا۔ انھوں نے اس کا تکیہ ہٹایا تو سر کے نیچے ایک استرا رکھا پایا۔ پوچھا: یہ کیا؟ والدین نے بتایا کہ ہم بچے کو جنات سے محفوظ رکھنے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ نے استرا پکڑ کر پھینک دیا اور کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شگون لینے کو برا سمجھتے تھے اور اس پر سخت ناراض ہوتے تھے (الادب المفرد، بخاری، رقم ۹۱۲)۔ البانی نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔

عہد عثمانی میں ایرانیوں سے اختلاط بڑھا تو عجم کی اخلاقی بیماریاں (کبوتر بازی، شطرنج، نرد وغیرہ) عربوں میں بھی راہ پانے لگیں۔ حضرت عائشہ کے ایک گھر میں کرایہ دار رہتے تھے۔ انھیں معلوم ہوا کہ وہ نرد (چوسر) کھیلتے ہیں تو وہ سخت برافروختہ ہوئیں اور کہلا بھیجا کہ اگر نرد کی گوٹیوں کو باہر نہ پھینکا تو میں تمھیں اپنے گھر سے نکلوا دوں گی (الادب المفرد،

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

بخاری، رقم ۱۲۷۴)۔ نرد، تختہ نرد، backgammon یا چوسر ایران اور مشرق وسطیٰ میں پانچ ہزار سال سے کھیلے جانے والا ایک پرانا کھیل ہے جس میں دو کھلاڑی پندرہ پندرہ مہروں یا گوٹوں سے ایک چوبی بساط پر بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم گھر آئے تو حضرت عائشہ بخار میں پھک رہی تھیں۔ بخار کی شکایت کرتے ہوئے انھوں نے اسے کوس دیا۔ آپ نے فرمایا: بخار کو گالی نہ دو، یہ اللہ کے حکم سے آتا ہے۔ اگر تو چاہے تو میں تمھیں ایسے دعائیہ کلمات سکھا دوں جن کے ذریعے سے اللہ بخار زائل کر دے۔ فرمایا: کہو، اے اللہ، میری نازک جلد پر رحم کر، میری ناتواں ہڈیوں سے بخار کی گرمی دور کر دے۔ اے ام ملدم، (بخار کی کنیت) اگر تو عظیم اللہ پر ایمان رکھتا ہے تو سر کو درد کر نہ منہ میں بو پیدا کر، گوشت کھا نہ خون پی۔ مجھے چھوڑ کر اس شخص کے پاس چلے جا جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود ٹھیراتا ہے۔ حضرت عائشہ نے یہ کلمات ادا کیے تو بخار چلا گیا (دلائل النبوۃ، بیہقی: ۱۶۹/۶۔ کنز العمال: ۲۸۵۰۸)۔ اس حدیث کے راوی عبد الملک بن عبد ربہ طائی پر نقد کیا گیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت عائشہ بچوں کے پھوڑوں، پھنسیوں کا علاج کرتی تھیں۔ ایک بچے کو دوا دینے کے بعد انھوں نے دیکھا کہ اسے (بغرض روحانی تاثیر) لوہے کی پازیبیں پہنائی گئی ہیں۔ حضرت عائشہ نے کہا: تم سمجھتے ہو کہ یہ پازیبیں اللہ کی لکھی ہوئی تکلیف دور کر دیتی ہیں۔ میں ان کو پہلے دیکھ لیتی تو تمھارا علاج ہی نہ کرتی۔ چاندی کی پازیبیں ان لوہے کی پازیبوں سے بہتر ہوتی ہیں (کیونکہ انھیں پہناتے وقت کوئی غیر مرئی تاثیر مطلوب نہیں ہوتی) (مستدرک حاکم، رقم ۷۵۰۸)۔

باندی سائبہ نے حضرت عائشہ کے گھر بھالا پڑا ہوا دیکھا تو پوچھا: ام المومنین، آپ اس سے کیا کرتی ہیں؟ بتایا: ہم اس سے چھپکلیاں مارتے ہیں۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خبر دے رکھی ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو چھپکلی کے علاوہ ہر جانور نے آگ بجھائی۔ چھپکلی پھونک کر اسے بھڑکاتی رہی۔ اس لیے آپ نے اسے مارنے کا حکم ارشاد کیا (مسلم، رقم ۵۹۰۵۔ ابن ماجہ، رقم ۳۲۳۱۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۵۳۴)۔ شبیر احمد عثمانی کہتے ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چھپکلی کو مارنے کا حکم اس لیے دیا کہ وہ ایک موذی جانور ہے۔ آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ اس کی فطری خباثت واضح کرنے کے لیے بیان فرمایا، ورنہ ظاہری بات ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کی چھپکلی کے جرم کی سزا آج کل کی چھپکلی کو نہیں دی جا سکتی۔ شوکانی کا کہنا ہے، نوع انساں سے عداوت چھپکلی کی جبلت میں پائی جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شیطان تھا جس نے چھپکلی کے

بھیس میں نار ابراہیم کو بھڑکایا۔

حضرت عائشہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سنایا: ''جس کسی نے غیر مملوکہ، بے آباد زمین کو آباد کیا تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔'' تو خلیفۂ ثانی حضرت عمر نے اسی کو قانون بنا دیا (بخاری، رقم ۲۳۳۵)۔

حضرت افلح بن قعیس نے حضرت عائشہ سے ملنے کی اجازت طلب کی تو انھوں نے منع کر دیا۔ حضرت افلح نے کہا: آپ مجھ سے پردہ کر رہی ہیں، حالاں کہ میں آپ کا رضاعی چچا ہوں۔ حضرت عائشہ نے پوچھا: وہ کیسے؟ بتایا: میرے بھائی ابوالقعیس کی بیوی، میری بھابھی نے آپ کو دودھ پلا رکھا ہے۔ حضرت عائشہ نے کہا: یا رسول اللہ، اس شخص نے تو نہیں، بلکہ اس کی بیوی نے مجھے دودھ پلا رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا: انھیں آنے دو، وہ تمھارے رضاعی چچا ہوئے۔ تب حضرت عائشہ نے کہنا شروع کیا، رضاعت کی بنا پر ان سب رشتوں کو حرام سمجھو جو تعلق نسب سے حرام ہوتے ہیں (بخاری، رقم ۶۱۵۶۔ مسلم، رقم ۳۵۶۳۔ ابوداؤد، رقم ۲۰۵۷۔ ترمذی، رقم ۱۱۴۸۔ نسائی، رقم ۳۳۱۹۔ ابن ماجہ، رقم ۱۹۴۹۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۰۵۴)۔ مسند احمد کی روایت ۲۵۶۵۱ میں مذکورہ صحابی کا نام حضرت ابوالجعید یا حضرت ابوالقعیس بیان ہوا ہے۔ ایک ملتی جلتی روایت میں حضرت حفصہ کے رضاعی چچا کا ذکر ہے (بخاری، رقم ۳۱۰۸۔ مسلم، رقم ۳۵۵۸)۔

ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو حضرت عائشہ کے پاس ایک شخص بیٹھا دیکھا۔ ابن حجر کہتے ہیں، شاید وہ حضرت ابوقعیس (وائل) کا بیٹا ہو۔ ناپسندیدگی سے آپ کے چہرۂ مبارک کا رنگ بدل گیا۔ انھوں نے بتایا: یہ میرا (رضاعی) بھائی ہے۔ آپ نے فرمایا: اپنے (رضاعی) بھائیوں کی پرکھ رکھو۔ رضاعت تو صرف بھوکے بچے کو دودھ پلانے سے ثابت ہوتی ہے (بخاری، رقم ۵۱۰۲۔ مسلم، رقم ۳۵۹۶۔ ابوداؤد، رقم ۲۰۵۸۔ نسائی، رقم ۳۳۱۴۔ ابن ماجہ، رقم ۱۹۴۵۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۶۳۲)۔ یہ روایت حضرت عائشہ ہی کی اس روایت کے معارض ہے: ''حضرت ابوحذیفہ کی بیوی حضرت سہلہ بنت سہیل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: (ہمارا لے پالک) سالم عاقل و بالغ ہو گیا ہے۔ وہ میرے پاس آتا جاتا ہے، ابوحذیفہ اسے برا سمجھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اسے دودھ پلا دو تو وہ تمھارے لیے محرم بن جائے گا اور ابوحذیفہ کی خفگی جاتی رہے گی۔'' حضرت سہلہ نے کہا: وہ تو (ڈاڑھی مونچھ والا) بڑا آدمی ہے؟ آپ مسکرائے اور فرمایا: میں جانتا ہوں کہ وہ بڑا شخص ہے۔ چنانچہ حضرت سہلہ نے اسے پانچ بار دودھ چسایا اور وہ ان کے رضاعی بیٹے کے مانند ہو گیا (مسلم، رقم ۳۵۹۰۔ ابوداؤد، رقم ۲۰۶۱۔ نسائی، رقم ۳۳۲۲۔ ابن ماجہ، رقم ۱۹۴۳۔ مستدرک حاکم، رقم ۲۶۹۲)۔ حضرت عائشہ نے اپنی بھتیجیوں، بھانجیوں، حتیٰ کہ

حضرت ام سلمہ کو بھی گھر میں آنے جانے والے ملازموں کے باب میں اسی طریقے پر عمل کرنے کا مشورہ دیا (موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۵۴۱۵)۔ اس باب میں انھوں نے پانچ دفعہ دودھ پلانے کی شرط لگائی اور کہا: ایک بار یا دو بار دودھ چسانا حرمت رضاعت ثابت نہیں کرتا (مسلم، رقم ۳۵۸۰۔ ابوداؤد، رقم ۲۰۶۳۔ ترمذی، رقم ۱۱۵۰۔ نسائی، رقم ۳۳۱۲۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۰۲۶)۔ سیدہ ام سلمہ اور باقی ازواج النبی نے پسند نہ کیا کہ گود میں بٹھائے بغیر اس طرح کی دودھ پلائی کے ذریعے سے وہ کسی شخص کو اپنے گھر میں داخل کر لیں۔ وہ حضرت عائشہ سے کہتی تھیں کہ شاید یہ ایک رخصت ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض سالم کے لیے جائز قرار دی ہو (مسلم، رقم ۳۵۹۵۔ ابوداؤد، رقم ۲۰۶۱۔ نسائی، رقم ۳۳۲۷۔ ابن ماجہ، رقم ۱۹۴۷)۔

ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپ نے پوچھا: عائشہ، تم اسے جانتی ہو؟ انھوں نے کہا: نہیں، تو فرمایا: یہ فلاں قبیلے کی مغنیہ ہے۔ تمھیں گانا سنانا چاہتی ہے۔ حضرت عائشہ نے ہاں کہا تو آپ نے اسے ایک تھالی دی تو (اس نے اسے بجا کر) ایک گانا سنایا۔ پھر آپ نے فرمایا: شیطان نے اس کے نتھنوں میں پھونک مار دی ہے (السنن الکبریٰ، نسائی، رقم ۸۹۱۱۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۱۵۷۲۰۔ المعجم الکبیر، طبرانی، رقم ۶۶۸۶)۔ تھالی دینے والی بات صرف مسند احمد میں بیان ہوئی ہے۔

تابعی منکدر حضرت عائشہ سے ملنے آئے تو انھوں نے پوچھا: آپ کی اولاد ہے؟ منکدر کے نہ کہنے پر فرمایا: اگر میرے پاس دس ہزار درہم ہوتے تو آپ کو عطیہ کر دیتی۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ شام ہونے سے پہلے ہی حضرت معاویہ نے انھیں مال بھیج دیا۔ حضرت عائشہ نے دس ہزار درہم بھیجے تو منکدر نے باندی خریدی، اسی سے محمد بن منکدر اور ان کے بھائی ابوبکر و عمر پیدا ہوئے۔

روایت حدیث

حضرت عائشہ سے مروی احادیث کی تعداد دو ہزار دو سو دس ہے۔ ان میں سے دو سو چھیاسی احادیث صحیحین کا حصہ ہیں۔ ان میں سے چون صرف بخاری میں، انہتر صرف مسلم میں اور ایک سو چوہتر متفق علیہ ہیں۔ حضرت عائشہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، اپنے والد حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت فاطمہ، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت اسید بن حضیر، حضرت جدامہ بنت وہب اور حضرت حمزہ بنت عمرو سے احادیث روایت کیں۔ ان سے روایت کرنے والے صحابہ میں شامل ہیں: حضرت عمر، ان کے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابوموسیٰ اشعری،

حضرت زید بن خالد، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ربیعہ بن عمرو، حضرت سائب بن یزید، حضرت صفیہ بنت شیبہ، حضرت عبداللہ بن عامر اور حضرت عبداللہ بن حارث۔ ان کے اہل خانہ میں سے ان لوگوں نے ان سے حدیث اخذ کی: ان کی بہن ام کلثوم بنت ابوبکر، ان کے رضاعی بھائی حضرت عوف بن حارث، ان کے بھتیجے قاسم بن محمد، بھتیجیاں حفصہ اور اسماء بنت عبدالرحمٰن، پوتے عبداللہ بن ابوعتیق اور محمد بن عبدالرحمٰن، بھانجے عبداللہ اور عروہ بن زبیر، حضرت اسماء کے پوتے عباد اور حبیب بن عبداللہ، حضرت عبداللہ بن زبیر کے پوتے عباد بن حمزہ، بھانجی عائشہ بنت طلحہ۔ حضرت عائشہ کے آزاد کردہ ابوعمر، ذکوان، ابویونس اور ابن فروخ۔ کبار تابعین میں سے حسب ذیل علم حدیث میں حضرت عائشہ کے خوشہ چیں ہیں: سعید بن مسیّب، عمرو بن میمون، علقمہ بن قیس، مسروق، عبداللہ بن حکیم، اسود بن یزید، عطاء بن ابورباح، عکرمہ، مجاہد، میمون بن مران، نافع بن جبیر، ابوعثمان نہدی، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن اور ابووائل۔ حضرت عائشہ کی شاگرد خواتین میں سے حفصہ بنت سیرین، عمرہ بنت عبدالرحمٰن اور عائشہ بنت طلحہ امتیازی مقام رکھتی ہیں۔ ان کے مرد شاگردوں میں عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن اور مسروق نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

وفات

حضرت عائشہ ایک بار بیمار ہوئیں، ان کی بیماری نے شدت پکڑی تو ان کے بھتیجوں نے مدینہ میں آنے والے ایک طبیب سے رجوع کیا۔ اس نے کہا کہ آپ کی بتائی ہوئی علامات تو اس عورت کی لگتی ہیں جسے جادو کیا گیا ہو۔ پتا چلا کہ حضرت عائشہ کی اس باندی نے جادو کیا ہے جسے وہ اپنی وفات کے بعد آزاد کرنے کا اعلان کر چکی ہیں، کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ آزادی جلد حاصل ہو جائے۔ حضرت عائشہ نے اسے کسی ایسے شخص کے ہاتھ بیچنے کا حکم دیا جو غلاموں کے ساتھ سخت سلوک کرنے میں عرب بھر میں مشہور ہو (موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۱۲۶۔ مصنف عبدالرزاق، رقم ۱۸۷۴۹)۔

حضرت عائشہ کے مرض الموت میں حضرت عبداللہ بن عباس ان سے ملنے آئے۔ پہلے تو انھوں نے ملنے سے انکار کیا، پھر اپنے بھتیجے، حضرت ابوبکر کے پوتے عبداللہ بن عبدالرحمٰن کے اصرار پر آنے دیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا: میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج سے محبت کرتا رہا ہوں، کیونکہ آپ پاکیزہ چیزوں ہی سے محبت کرتے تھے۔ آپ پہلے چلے جانے والی دو صادق ہستیوں کے پاس جا رہی ہیں، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور

ابوبکر (بخاری، رقم ۳۷۷۱)۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے مزید کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے علاوہ کسی کنواری خاتون سے شادی نہیں کی۔ آپ پاکیزہ اشیا کو پسند کرتے تھے اور آپ انھیں بہت محبوب تھیں۔ ابوا کی رات آپ کا ہار گم ہوا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے ڈھونڈنے کی خاطر رک گئے۔ اس موقع پر پانی میسر نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں تیمّم کی نعمت عطا ہوئی۔ اللہ نے ساتویں آسمان سے آپ کی براءت نازل کی۔ ہر مسجد میں اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہ آیات براءت تلاوت کی جاتی ہیں۔ حضرت عائشہ نے کہا: ابن عباس، رہنے دو، میری آرزو ہے کہ کاش، میں بھولی بسری اور گم نام ہوتی (مستدرک حاکم، رقم ۶۷۲۶۔ حلیۃ الاولیاء، رقم ۱۴۶۲)۔ حضرت ابن عباس کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر آئے تو حضرت عائشہ نے کہا: پہلے ابن عباس آکر میری تعریفیں کر چکے، میں تو یہی چاہتی ہوں، بھولی بسری شے ہو جاؤں (بخاری، رقم ۴۷۵۳۔ موسوعۂ مسند احمد، رقم ۲۴۹۶)۔

وفات سے پہلے فرمایا: کاش، میں ایک درخت ہوتی یا درخت کا ایک پتا ہوتی، کاش میں ایک پتھر ہوتی، کاش میں مٹی کا ڈھیلا ہوتی۔ راوی نے بتایا: اس کا مطلب توبہ کرنا تھا۔ حضرت عائشہ نے وفات سے پہلے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رخصت ہونے کے بعد ایک بدعت کا ارتکاب کیا۔ ذہبی کہتے ہیں کہ ان کی مراد جنگ جمل میں حصہ لینا تھا۔ انھیں اس پر بہت شرمندگی تھی، حالاں کہ انھوں نے طلب خیر کرتے ہوئے اس جنگ میں شمولیت کی تھی (مستدرک حاکم، رقم ۶۷۱۷)۔ ایک بار کہا: عبداللہ بن عمر گزریں تو میری ان سے بات کرانا۔ جب وہ آئے تو کہا: ابوعبدالرحمٰن، آپ نے مجھے بصرہ جانے سے کیوں نہیں روکا؟ انھوں نے کہا: آپ پر عبداللہ بن زبیر کے مشوروں کا غلبہ تھا۔

وقت شہادت حضرت عمر نے روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تدفین کی اجازت چاہی تو حضرت عائشہ نے اپنی جگہ ان کو عطیہ کر دی، البتہ دیگر صحابہ نے ایسی درخواست کی تو انھوں نے قبول نہ کی (بخاری، رقم ۷۳۲۸)۔

حضرت عائشہ نے ۱۷ / رمضان ۵۷ھ (۱۹ / رمضان ۵۸ھ: ابن سعد، ۱۳ جولائی ۶۷۸ء) بروز منگل چھیاسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی۔ انھوں نے اپنے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیر کو وصیت کی کہ مجھے جنت البقیع میں باقی ازواج مطہرات کی قبروں کے ساتھ رات کے وقت سپرد خاک کیا جائے۔ اپنے حجرے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تدفین کرنے سے منع کر دیا اور کہا: میں نہیں چاہتی کہ دوسری ازواج سے بڑھ کر مجھے سراہا جائے (بخاری، رقم ۷۳۲۷)۔ وتر ادا کرنے کے بعد گورنر مدینہ مروان بن عبدالملک کے نائب حضرت ابوہریرہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ مدینہ کے بالائی علاقوں سے کئی لوگ جنازے میں شرکت کے لیے آئے۔ زیتون کے تیل میں بھگوئے ہوئے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پارچے لکڑیوں پر لٹکا کر روشن کیے گئے اور جنازہ قبرستان کی طرف لے جایا گیا۔ عورتوں کی ایک کثیر تعداد جنت البقیع میں موجود تھی۔ قبر کے گرد پردہ تانا گیا، قبر میں حضرت عائشہ کے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیر، عروہ بن زبیر اور حضرت ابوبکر کے پوتے قاسم بن محمد، عبداللہ بن محمد اور عبداللہ بن عبدالرحمٰن اترے۔

حضرت عائشہ کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ ایک شاذ روایت کے مطابق ان کے ہاں ایک مردہ بچہ ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام عبداللہ رکھا اور حضرت عائشہ نے اسی بچے کے نام پر ام عبداللہ کی کنیت اختیار کی۔ یہ روایت سند کے اعتبار سے نہایت کم زور ہے اس لیے اہل علم نے اسے درست نہیں مانا۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، الجامع المسند الصحیح المختصر (بخاری، شرکۃ دارالارقم) المسند الصحیح المختصر من السنن (مسلم، شرکۃ دارالارقم)، الجمل من انساب الاشراف (بلاذری)، تاریخ الامم و الملوک (طبری)، احکام القرآن (جصاص)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، احکام القرآن (ابن عربی)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، اسدالغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال (مزی)، سیر اعلام النبلاء (ذہبی)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، تہذیب التہذیب (ابن حجر)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (مقالہ، امین اللہ وثیر)، سیرت عائشہ (سید سلیمان ندوی)، Wikipedia, the free encyclopedia۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مقالات

رضوان اللہ

واقعۂ نوح

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہ انسانی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے جس کا بیان ہمیں کئی مذہبی روایات میں ملتا ہے۔ بائیبل میں تاریخی ترتیب کے ساتھ اس کی تفصیل آئی ہے تو قرآن میں تذکیری انداز کے مطابق جستہ جستہ اس کے متعلق بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ دونوں کتابیں الہامی ہونے کے لحاظ سے چونکہ ایک ہی روایت کی امین ہیں اور ان میں اکثر و بیش تر واقعات باہم موافق پائے جاتے ہیں، اس لیے ان میں یہ واقعہ بھی اپنی اصل کے لحاظ سے ایک سا آیا ہے۔ تاہم، کئی مقامات پر یہ اپنے بیان میں مختلف بھی ہو گیا ہے اور تورات کی نقل میں غلطی، اِلحاق اور تحریف جیسے امکانات کے ہوتے ہوئے ایسا ہو جانا ناممکن نہیں ہے۔ اس واقعہ کی تفصیلات کیا ہیں؟ ان سے تو ہم سب لوگ واقف ہیں اور اُنھیں یہاں بیان کرنے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں، مگر اس کے بارے میں چند سوالات ایسے پیدا ہوتے ہیں جو شدت سے اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ اُن کے تشفی بخش جواب ضرور دیے جائیں، مثال کے طور پر:

۱۔ حضرت نوح علیہ السلام کیا سب انسانوں کی طرف مبعوث ہوئے؟

۲۔ طوفان نوح کیا پوری زمین پر آیا؟

۳۔ اُن کی کشتی میں کون سوار ہوئے؟

۴۔ کیا نوح کے اہل محض اہل ہونے کی بنا پر سوار ہوئے؟

۵۔ آج کے سب انسان کس کی اولاد ہیں؟

۶۔سیدنا ابراہیم کیا واقعی حضرت نوح کی نسل سے ہیں؟

ہم ذیل میں ان سوالات کے جواب میں اپنی معروضات پیش کرتے ہیں:

۱۔حضرت نوح علیہ السلام کیا سب انسانوں کی طرف مبعوث ہوئے؟

عام طور پر خیال کیا گیا ہے کہ نوح علیہ السلام کی بعثت اُن کے زمانے کے سب انسانوں کی طرف ہوئی۔اس خیال کی دلیل اس کے سوا کچھ نہیں کہ آدم اور نوح کا زمانہ چونکہ بہت قریب کا ہے، اس لیے غالب اِمکان یہی ہے کہ آدم کی نسل ابھی ایک ہی جگہ قیام رکھتی ہوگی اور نوح کو ان سب کی طرف مبعوث کر دیا گیا ہوگا۔قرآن کے بیانات اس زمانی قرب کی بالکل تائید نہیں کرتے۔مثلاً اس میں بتایا گیا ہے کہ نوح سے پہلے آدم کی اولاد میں نبوت کا باقاعدہ سلسلہ قائم رہا ہے[۱]۔یہ، ظاہر ہے کہ ان دونوں کے درمیان میں پائی جانے والی ایک لمبی مدت پر دلالت کرتا ہے۔یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نوح کے زمانے میں شرک کی پوری رام لیلا، ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کی صورت میں وجود پذیر ہو چکی تھی[۲]۔اس کا وجود بھی دلالت کرتا ہے کہ انسان کی پیدایش کے بعد اچھا خاصا زمانہ گزر چکا ہے کہ اس طرح کی ہستیاں اپنی موت کے عرصۂ دراز بعد ہی خداؤں کی صورت میں ڈھلا کرتی ہیں۔بلکہ بائیبل کے بیانات کو اگر صحیح مان لیا جائے تو آدم اور نوح کی پیدایش میں پائی جانے والی مدت تو بالکل متعین ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہے، یعنی ۱۰۵۶ سال۔اس میں اُن کی بعثت تک کی عمر مزید شامل کی جاسکتی ہے۔اب اس قدر طویل زمانے کے ساتھ ساتھ انسان کی انتہا درجے کی تجسس پسند فطرت، سماجی و معاشرتی عوامل اور معیشت کی مجبوریوں کا اگر لحاظ رہے تو یہ فرض کر لینا بالکل محال ہو جاتا ہے کہ انسان زمانۂ نوح میں ایک ہی علاقے میں قیام پذیر رہا ہوگا اور مختلف علاقوں میں ہجرت نہ کر گیا ہوگا۔قیاس یہی کہتا ہے کہ نوح کے زمانے تک جس طرح آدم کی اولاد سے مختلف نسلیں ظہور میں آچکی ہوں گی، اسی طرح یہ سب لوگ زمین کے مختلف علاقوں میں آباد بھی ہو گئے ہوں گے۔سو ان حالات میں یہ مان لینا کسی طرح ممکن نہیں رہتا کہ ایک پیغمبر کو ایک وقت میں سب انسانوں کی طرف مبعوث کر دیا جائے، بلکہ یہی بات قوی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت نوح کی بعثت سب کے بجائے بعض لوگوں کی طرف کی گئی ہو۔اور یہ وہ بات ہے جسے قرآن مجید نے بھی لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔فرمایا ہے:

۱۔ مریم ۱۹:۵۸۔

۲۔ نوح ۷۱:۲۳۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اِنَّآ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِهٖٓ اَنۡ اَنۡذِرۡ قَوۡمَكَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِيَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ.

’’ہم نے نوح کو اُس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا کہ اپنی قوم کو خبردار کرو، اِس سے پہلے کہ ایک دردناک عذاب اُن پر آ جائے۔‘‘ (نوح ۷۱:۱)

یہاں واضح طور پر فرمایا ہے کہ ہم نے نوح کی بعثت اُس کی قوم کی طرف کی اور یہ کہتے ہوئے کی کہ اپنی قوم کو خبردار کرو۔ نوح کی اس قوم کا ذکر قرآن نے مختلف پیراؤں میں اور بار بار کیا ہے۔ اس تسلسل اور تکرار سے اُن کی قوم کا یہ ذکر اُس وقت بے جا اور قطعی مہمل قرار پاتا ہے، جب قوم نوح کے علاوہ کوئی دوسری قوم سرے سے پائی نہ جاتی ہو اور حضرت نوح کو تمام انسانوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہو۔

۲۔ طوفان نوح کیا پوری زمین پر آیا؟

اس بارے میں رائج رائے یہی ہے کہ طوفان نوح پورے کرۂ ارض پر آیا۔ اس رائے کی بنیاد اصل میں قرآن اور بائیبل، دونوں میں آنے والا محض ایک لفظ، یعنی ’’زمین‘‘ ہے۔ قرآن میں اس کے لیے ’اَلۡاَرۡض‘ استعمال ہوا ہے اور لوگوں نے اس سے پوری زمین مراد لے لی ہے، حالاں کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ قرآن میں جس طرح پوری زمین کے لیے آتا ہے، اسی طرح زمین کے کسی خاص حصہ کے لیے معہود ہو کر بھی آتا ہے۔ فرعون کے بارے میں فرمایا ہے:

اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِی الۡاَرۡضِ

’’واقعہ یہ ہے کہ سرزمین مصر میں فرعون نے سرکشی اختیار کر لی تھی۔‘‘ (القصص ۲۸:۴)

یہاں ’اَلۡاَرۡض‘ کا لفظ زمین کے ایک مخصوص حصے، یعنی مصر کے لیے آیا ہے کہ فرعون کی سرکشی اس کے زیر نگیں علاقے میں تھی، نہ کہ پورے کرۂ ارض میں۔ بالکل اسی طرح حضرت نوح کی دعا ہو، اُن کی قوم پر آنے والے عذاب کا ذکر ہو یا اس عذاب کے اختتام کا بیان ہو، ان سب مقامات پر ’’زمین‘‘ کا لفظ اپنے معہود کے اعتبار سے آیا ہے اور اس سے مراد وہ مخصوص علاقہ ہے، جہاں اُن کی قوم آباد تھی۔ اس معہود کو ماننے کی وجہ یہ ہے کہ یہ معمول میں آنے والا کوئی طوفان نہیں، بلکہ خدا کا عذاب تھا، اس لیے ضروری تھا کہ یہ اُن لوگوں پر اور اُسی علاقے میں آئے، جہاں خدا کی طرف سے اتمام حجت کیا جا چکا ہو۔

ہماری رائے میں بائیبل کا بیان اس معاملے میں قرآن سے مختلف نہیں، بلکہ اُس کے عین مطابق ہے۔ اس میں بھی ’’زمین‘‘ یا ’’روے زمین‘‘ جیسے الفاظ سے مراد اصل میں یہی معہود ذہنی ہے۔ باقی اس کے راویوں کا حسن کمال

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہے کہ اُنھوں نے ہمارے لوگوں کی طرح پہلے اسے پوری زمین قرار دیا اور پھر اسی کے مطابق سارے واقعہ کو بیان کر دیا۔

۳۔ اُن کی کشتی میں کون سوار ہوئے؟

یہ سوال اصل میں دو ضمنی سوالات پر مشتمل ہے: ایک یہ کہ کون سے جانور سوار ہوئے؟ دوسرے یہ کہ انسانوں میں کون کون سوار ہوئے؟ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے تو اس کا جواب عام طور پر یہ دیا گیا ہے کہ حضرت نوح کو حکم ہوا تھا کہ وہ ہر قسم کے جانوروں کا نر و مادہ اپنے ساتھ کشتی میں سوار کر لیں۔ اس کے لیے قرآن اور بائیبل، دونوں میں آنے والے لفظ 'کُلّ' کو دلیل بنایا گیا ہے، دراں حالیکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن میں اس 'کُلّ' کا استعمال جس طرح ہر ہر چیز کے لیے ہوا ہے، اسی طرح کچھ مخصوص چیزوں کے لیے بھی ہوا ہے، جیسا کہ اس آیت میں:

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ. (الانبیاء ۲۱: ۳۳)

''حقیقت یہ ہے کہ وہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا ہے۔ اِن میں سے ہر ایک (اپنے) ایک مدار میں گردش کر رہا ہے۔''

یہاں 'کُلّ' سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہر چیز اپنے مدار میں گردش کر رہی ہے، بلکہ اس کا مطلب ہے کہ سورج اور چاند، ان میں سے ہر کوئی اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے۔ یہی معاملہ حضرت نوح کو دیے جانے والے حکم کا ہے۔ اس میں بھی 'کُلّ'، معہود ذہنی کے لحاظ سے بولا گیا ہے اور اس سے مراد کچھ خاص جانور ہیں جو اُن لوگوں کے تصرف میں اور ان کی عمومی ضروریات کے لیے ہیں۔ 'کُلّ' یہاں عہد کے لیے ہے، اس کی دلیل طوفان کے موقع پر اس کا استعمال ہے اور یہ ایسا ہی استعمال ہے، جیسا کہ ہم اپنی زبان میں کسی علاقے میں آنے والے سیلاب کے پیش نظر اعلان کریں: لوگو، ''سب'' مال اور جانور لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ ظاہر ہے، اس سے مراد ہماری ضرورت اور استعمال کے جانور ہی ہوں گے، نہ کہ درندوں، پرندوں، چرندوں اور کیڑوں مکوڑوں سمیت دنیا بھر کے سب جانور۔[۳]

ہمارے نزدیک اگر بائیبل کے راویوں کی حاشیہ آرائی سے قطع نظر کر لیا جائے تو اس میں بھی ''کل'' اور ''ہر قسم''

۳۔ المومنون ۲۳ کی آیت ۲۷ میں جانوروں کو سوار کرنے کے لیے 'فَاسْلُكْ' کا لفظ آیا ہے۔ یہ لفظ اپنے اندر مفعول کے لیے ایک طرح کے تسلط اور غلبے کا مفہوم رکھتا ہے۔ لہٰذا ہمیں بار بار خیال ہوتا ہے کہ اسے لانے میں بھی یہ اشارہ موجود ہے کہ کشتی میں صرف اُن مخصوص جانوروں کو بٹھایا جائے جو لوگوں کے زیر تصرف اور اُن کے قابو میں ہوں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وغیرہ کے الفاظ اصلاً اسی طریقہ سے آئے ہیں اور ان سے مراد کچھ خاص جانور ہی ہیں، اس لیے کہ یہی بات زبان کے اصولوں کے مطابق ہے اور اسی بات کا اِمکان نوح اور اُن کی کشتی کے حجم کے تناظر میں تسلیم کیا جا سکتا ہے۔[4] بلکہ ''کل'' کا لفظ بول کر کچھ خاص چیزوں کو مراد لینے کی ایک اور مثال ہمیں تورات کے اِسی مقام پر مل جاتی ہے۔ فرمایا ہے: ''تو ہر طرح کی کھانے کی چیز لے کر اپنے پاس جمع کر لینا''۔[5] ظاہر ہے، اس میں ''ہر طرح کی کھانے کی چیز'' سے مراد عام طور پر اُن کے کھانے میں آنے والی چیزیں ہی ہیں۔

دوسرے سوال کا کہ اس کشتی میں کون لوگ سوار ہوئے، بعض حضرات کی طرف سے یہ جواب دیا گیا ہے کہ اس میں صرف نوح کے گھر والے ہی سوار ہوئے۔ یہ اصل میں تورات کا بیان ہے اور وہیں سے ہمارے ہاں رواج پا گیا ہے۔ وگرنہ ہم جانتے ہیں کہ نوح پر اُن کی قوم کے بھی بعض لوگ ایمان لا چکے تھے،[6] اور واضح سی بات ہے کہ اُن کے لیے بھی اب یہی فیصلہ ہونا تھا کہ وہ نوح کی کشتی میں بیٹھ کر لازماً نجات پائیں۔ قرآن مجید نے اس بات کو بڑی صراحت کے ساتھ لفظوں میں بھی بیان کر دیا ہے:

قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ. (ہود ۱۱: ۴۰)

''ہم نے کہا: ہر قسم کے (جانوروں کے) جوڑے اِس میں رکھ لو، (نر و مادہ) دو دو اور (اُن کے ساتھ) اپنے گھر والوں کو بھی اِس کشتی میں سوار کرا لو، سوائے اُن کے جن کے بارے میں حکم صادر ہو چکا ہے، اور اُن کو بھی جو ایمان لائے ہیں ـــــ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے۔''

دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ یہاں 'وَمَنْ اٰمَنَ' کو 'اَهْلَكَ' پر عطف کیا گیا ہے۔ یہ مغایرت کا تقاضا کرتا اور یوں بڑی خوبی سے اس بات کو بیان کر دیتا ہے کہ نوح کو اپنے اہل کے علاوہ کچھ اور مومنین کو بھی سوار کرنے کا حکم ہوا تھا۔

---

[4] بائیبل میں بیان کردہ کشتی کی لمبائی اگر صحیح مان بھی لی جائے جو ۵۱۰ فٹ، یعنی تقریباً فٹ بال کے ڈیڑھ میدان کے برابر بنتی ہے تو بھی اس میں دنیا بھر کے جانوروں کا سما جانا کسی طرح ممکن نہیں۔ اور اگر قرآن کا بیان سامنے رکھا جائے جو کسی بڑے جہاز کا تصور دینے کے بجائے اسے کچھ تختوں اور کیلوں سے بنی ہوئی کشتی قرار دیتا ہے تو یہ بات مان لینا اور بھی مشکل ہو جاتا ہے (کتاب پیدایش ۶: ۱۵۔ القمر ۵۴: ۱۳)۔

[5] کتاب پیدایش ۶: ۲۱۔

[6] ہود ۱۱: ۳۶۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۴۔ کیا نوح کے اہل محض اہل ہونے کی بنا پر سوار ہوئے؟

حضرت نوح کے اہل کو کشتی میں سوار کرنے کا حکم کس بنیاد پر دیا گیا؟ بعض حضرات کے نزدیک اس کی وجہ اُن کا محض حضرت نوح کے اہل میں سے ہونا ہے۔ یہ راے بنیادی طور پر تورات میں آنے والے ایک حکم سے مترشح ہوتی ہے:

''اور خداوند نے نوح سے کہا کہ تو اپنے پورے خاندان کے ساتھ کشتی میں آ، کیونکہ میں نے تجھی کو اپنے سامنے اس زمانہ میں راست باز دیکھا ہے۔'' (کتاب پیدایش ۷:۱)

اسے پڑھ کر بادی النظر میں یہی مفہوم ہوتا ہے کہ اُس وقت صرف نوح راست باز تھے اور یہ اُن کی راست بازی کا گویا انعام تھا کہ اُن کا خاندان بھی محض اُن کا خاندان ہونے کی وجہ سے بچا لیا جائے۔

اس راے کو ایک اور طرح سے بھی بیان کیا گیا ہے، وہ یہ کہ حضرت نوح کو چونکہ منکرین کی طرف سے مار دینے کی دھمکی دی گئی تھی، اس لیے اُن کی دعا کی قبولیت اس طرح سے ہوئی کہ انھیں اُن کے خاندان سمیت بچا لیا گیا۔ اس کی دلیل میں قرآن کے اُن مقامات کو پیش کیا گیا ہے، جہاں نوح کو اپنے گھر والوں کو کشتی میں سوار کرنے کا حکم دیتے ہوئے 'اَهۡلَكَ' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اس معاملہ میں اُن کے اہل کے لیے اُن کا اہل ہونا ہی مدار نجات تھا۔ اس کی تائید میں یہ دلیل بھی لائی گئی ہے کہ جب نوح کا بیٹا عذاب کی گرفت میں آ گیا اور انھوں نے 'اِنَّ ابۡنِیۡ مِنۡ اَهۡلِیۡ' (ہود ۱۱:۴۵) کہتے ہوئے خدا سے التجا کی تو اس کے جواب میں یہ کہنے کے بجاے کہ وہ ایمان نہ لایا تھا، اس لیے غرق ہوا، یہ کہا گیا: 'اِنَّهٗ لَیۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ'، وہ تمھارے اہل میں سے نہ تھا، اس لیے غرق ہوا (ہود ۱۱:۴۶)۔

یہ راے جن حضرات نے پیش کی ہے، اُن سے جس طرح اسلام کے بنیادی اصولوں سے یک سر اِعراض ہوا ہے، اِسی طرح خاص اس واقعہ کے بارے میں بیان کردہ تصریحات سے بھی مکمل طور پر صرف نظر ہو گیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اسلام میں حسب نسب کی حیثیت فقط باہمی تعارف اور پہچان کی ہے۔ خدا کے ہاں اگر کسی چیز کی اہمیت ہے تو وہ ایمان اور عمل صالح کی ہے۔ بالخصوص اُس کی عدالت میں، چاہے وہ عدالت آخرت کی ہو یا رسالت کے نتیجے میں اس دنیا میں برپا کر دی گئی ہو۔ چنانچہ یہ بات کسی طرح باور نہیں آتی کہ حضرت نوح کو رسول بنا کر بھیجا جائے اور منکرین کی تکذیب کے نتیجے میں عذاب سر پر آن پہنچے اور اُس وقت نجات کے فیصلے حق و باطل کے بجاے نسل اور خاندان کی بنیاد پر کیے جائیں، اور نوح کے اہل و عیال جو اُن کی دعوت کے براہ راست مخاطب بھی ہیں، محض اُن کے

اہل ہونے کی وجہ سے بچا لیے جائیں۔اس کے برخلاف، اگر قرآن کی تصریحات دیکھی جائیں تو وہ اس سارے معاملے کو ایک اور طرح سے بیان کرتی ہیں۔ان کے مطابق یہ سب ایمان اور کفر کی بنیاد پر ہوا۔نوح اپنی قوم کو دعوت دیں یا اُنھیں تنبیہ کریں۔نجات کی دعا کریں یا عذاب کی درخواست کریں۔خدا اپنے عذاب کا فیصلہ سنائے یا نجات پانے والوں کا بیان کرے۔کامیابی کا مژدہ سنائے یا ناکام ہونے والوں پر لعنت کا بیان کرے[7]؛اس طرح کے ہر موقع پر ایمان و کفر، توحید و شرک، رسول کی معیت اور اس کی تکذیب ہی کا صراحت سے ذکر ہوا ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ حضرت نوح کو جب حکم دیا گیا کہ وہ لوگوں کو کشتی میں سوار کریں تو اُس وقت بھی اسی اصل اصول پر اُن سے فرمایا ہے:

قُلۡنَا احۡمِلۡ فِیۡهَا مِنۡ كُلٍّ زَوۡجَیۡنِ اثۡنَیۡنِ وَاَهۡلَكَ اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَیۡهِ الۡقَوۡلُ وَمَنۡ اٰمَنَ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیۡلٌ. (ہود۱۱:۴۰)

”ہم نے کہا: ہر قسم کے (جانوروں کے) جوڑے اِس میں رکھ لو، (نر و مادہ) دو دو اور (اُن کے ساتھ) اپنے گھر والوں کو بھی اِس کشتی میں سوار کرا لو، سوائے اُن کے جن کے بارے میں حکم صادر ہو چکا ہے، اور اُن کو بھی جو ایمان لائے ہیں ـــــ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے۔“

یہ حکم حسب نسب کے بجاے ایمان کی بنیاد پر دیا گیا، اس بات کی دلیل 'اَهۡلَكَ' پر آنے والا 'اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَیۡهِ الۡقَوۡلُ' کا استثنا ہے اور اس کے بعد 'وَمَنۡ اٰمَنَ' کے الفاظ میں بیان ہونے والا وصف ایمان ہے۔یہ دو چیزیں بڑی وضاحت سے بتا رہی ہیں کہ اس معاملہ میں نوح کے خاندان کی نجات کے لیے ایمان ہی اصل معیار قرار دیا گیا۔بلکہ ایک اور مقام پر 'اِلَّا مَنۡ سَبَقَ عَلَیۡهِ الۡقَوۡلُ' کے بعد 'وَلَا تُخَاطِبۡنِیۡ فِی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا اِنَّهُمۡ مُّغۡرَقُوۡنَ'[8] کے الفاظ کے ذریعے سے اس معیار کو ایمان و کفر، دونوں پہلوؤں سے خوب واضح کر دیا گیا ہے۔

یہ تو رہی اصولی بات۔اب جہاں تک اس راے کے حق میں دی گئی پہلی دلیل کا تعلق ہے تو ہم اس پر عرض

---

[7] ان تمام تصریحات کے لیے ترتیب سے یہ آیات دیکھ لی جا سکتی ہیں: 'اَنۡ لَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّا اللّٰهَ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡكُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ اَلِیۡمٍ' (ہود۱۱:۲۶)۔'وَلَا تَكُنۡ مَّعَ الۡكٰفِرِیۡنَ' (ہود۱۱:۴۲)۔'وَنَجِّنِیۡ وَمَنۡ مَّعِیَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ' (الشعراء ۲۶:۱۱۸) اور 'وَلِمَنۡ دَخَلَ بَیۡتِیَ مُؤۡمِنًا' (نوح۷۱:۲۸)۔'رَبِّ لَا تَذَرۡ عَلَی الۡاَرۡضِ مِنَ الۡكٰفِرِیۡنَ دَیَّارًا' (نوح ۷۱:۲۶)۔'وَلَا تُخَاطِبۡنِیۡ فِی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا اِنَّهُمۡ مُّغۡرَقُوۡنَ' (ہود۱۱:۳۷)۔'فَاَنۡجَیۡنٰهُ وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗ فِی الۡفُلۡكِ' (الاعراف۷:۶۴)۔'اِنَّ الۡعَاقِبَةَ لِلۡمُتَّقِیۡنَ' (ہود۱۱:۴۹)۔'وَقِیۡلَ بُعۡدًا لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ' (ہود۱۱:۴۴)۔

[8] المومنون۲۳:۲۷۔

کریں گے کہ 'اَھْلَکَ' کے لفظ اور اس کی تکرار کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اہل محض اہل ہونے کی بنا پر سوار کر لیے جائیں۔ قرآن مجید میں اس واقعہ کے ذیل میں دو مقامات پر 'اَھْلَکَ' کا لفظ استعمال ہوا ہے، مگر ان دونوں مقامات پر وہ اپنے عموم کے بجائے تخصیص میں ہوا ہے۔ یعنی، اس لفظ سے مراد تمام اہل و عیال سرے سے ہے ہی نہیں کہ اس سے کوئی شخص اہل ہونے کو نجات کی وجہ قرار دے۔ مذکورہ بالا آیت میں اس تخصیص کی دلیل اس لفظ کو استعمال کرنے کا موقع اور اس پر عطف ہونے والے 'وَمَنْ اٰمَنَ' کے الفاظ ہیں۔ دوسرے اس پر آنے والا 'اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْہِ الْقَوْلُ' کا استثنا ہے جس نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ سوار ہونے کے اس حکم میں اہل سے آپ کے تمام اہل نہیں، بلکہ وہ خاص اہل مراد ہیں جن کے بارے میں خدا کے عذاب کا فیصلہ صادر نہیں ہو چکا۔ بلکہ دوسری جگہ پر اِس استثنا کے بعد آنے والے 'وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا' کے الفاظ نے تو سلبی طریقے سے بھی اس تخصیص کو نمایاں کر دیا ہے۔ سو 'اَھْلَکَ' میں پائی جانے والی یہی تخصیص ہے جو اِعادۂ معرفہ کے اصول پر اس واقعہ کے تفصیلی بیان میں آخر تک موجود رہی ہے، یعنی نوح نے التجا کرتے ہوئے جب 'اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَھْلِیْ' کہا ہے تو اس سے اُن کی مراد یہی ہے کہ پروردگار، میرا بیٹا تو میرے اُن خاص اہل میں سے تھا جن کے بارے میں عذاب کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔[9] اس کے جواب میں خدا نے جب 'اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِکَ' کہا ہے تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ تمھارے اُن خاص اہل میں سے نہیں تھا، بلکہ ہمارے فیصلہ کی زد میں آیا ہوا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ 'اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ' وہ اپنی ذات میں سراسر برائی ہو چکا تھا۔

'اَھْلَکَ' کی یہ تخصیص اِس رائے کے حق میں دی ہوئی دوسری دلیل کا بھی مکمل طور پر جواب ہو گئی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے اب یہ ممکن نہیں رہا کہ 'اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِکَ' کا مطلب یہ لیا جائے کہ وہ تمھارے خاندان میں سے نہیں، یعنی تمھارا اپنا بیٹا نہیں ہے۔ تاہم، بعض حضرات کو اُس کی نسبت کے انکار کرنے پر اس قدر اصرار ہے کہ اُنھوں نے اسے موکد کرنے کے لیے ایک اور مقام سے دلیل اٹھائی ہے۔ وہ مقام یہ ہے:

9۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ نوح کے بیٹے نے کشتی میں سوار ہونے سے یک سر انکار کیا، مگر انھوں نے پھر بھی اس کے متعلق یہ کیوں کہا کہ وہ تو میرے اُن اہل میں سے تھا جس کے بارے میں عذاب کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے جواب میں ہماری رائے یہ ہے کہ اُن کا بیٹا چونکہ منافق تھا، اس لیے وہ اُس کے ظاہر کے اعتبار سے خدا سے التجا کر رہے تھے۔ جو حضرات ہماری اِس رائے کے تفصیلی دلائل اور اس کے مقابل آرا پر محاکمہ دیکھنا چاہیں، وہ ہمارے ایک مضمون ''نوح کا بیٹا'' کی مراجعت کر سکتے ہیں: ماہنامہ اشراق، مارچ ۲۰۱۵ء۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوا امۡرَاَتَ نُوۡحٍ وَّامۡرَاَتَ لُوۡطٍ كَانَتَا تَحۡتَ عَبۡدَيۡنِ مِنۡ عِبَادِنَا صَالِحَيۡنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمۡ يُغۡنِيَا عَنۡهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيۡـًٔا. (التحریم ۶۶:۱۰)

''اللہ منکروں کے لیے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے۔ دونوں ہمارے بندوں میں سے دو صالح بندوں کے گھر میں تھیں، مگر اُنھوں نے اپنے شوہروں سے بے وفائی کی تو اللہ کے مقابلے میں وہ اُن کے کچھ کام نہ آ سکے۔''

اُنھوں نے اس آیت میں آنے والے لفظ 'خیانت' سے حضرت نوح کی بیوی کے بدچلن ہونے پر استدلال کیا ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر اُس بیٹے کی نوح کے ساتھ نسبت کا انکار کر دیا ہے۔ اس استدلال کے پہلے جز پر ہم عرض کریں گے کہ خدا کے رسول اپنے مخاطبین کے سامنے اخلاق کی اعلیٰ مثال ہوتے ہیں۔ اُن کے منکرین بھی اِس بات کی اُن کے حق میں شہادت دیتے ہیں اور اگر وہ کہیں ضد میں آ کر الزام لگا بیٹھیں تو اس عالم کا پروردگار خود اُن کی طرف سے جواب دیتا اور اُن کے اچھے اخلاق پر اپنی مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جب اپنے لوگوں کے ساتھ بدخواہی[10] اور مال وزر کے لیے قیدی پکڑنے[11] کا بہتان تراشا گیا تو ہم جانتے ہیں کہ قرآن میں کس اہتمام سے حقیقت حال کو واضح کیا گیا۔ بلکہ منافقین کی طرف سے جب ازواج مطہرات کے کردار کو داغ دار کرنے کی کوششیں ہوئیں تو اُس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے آگے بڑھ کر اُن کی براءت کا اعلان کیا[12]۔ ان فتنوں سے بچنے کی تدابیر بتائیں[13]، یہاں تک کہ اس گندگی سے پاک کرنے کے مقصد سے اُن کے لیے کچھ خاص احکام بھی اتارے[14]۔ اور یہ سب اس لیے ہوا کہ اللہ کے رسول پر اپنے گھر کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے بھی کوئی الزام نہ آنے پائے۔ مبادا وہ اخلاقی حیثیت سے لوگوں میں تنقید کا ہدف ٹھیریں اور نتیجے میں اُن کی دعوت بالکل بے اثر ہو کر رہ جائے۔ اللہ کے رسول کا لوگوں کے لیے مثال ہونا اور اللہ کا اِس مثال کو قائم رکھنے کے لیے اُن کے ساتھ یہ معاملہ کرنا، اس سب کے ہوتے ہوئے یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ اللہ کے ایک اور رسول، حضرت نوح کی بیوی برے اخلاق و کردار

۱۰؎ آل عمران ۳:۱۶۱۔

۱۱؎ الانفال ۸:۶۷۔

۱۲؎ النور ۲۴:۱۱-۱۸۔

۱۳؎ الاحزاب ۳۳:۵۹۔

۱۴؎ الاحزاب ۳۳:۳۲-۳۴۔

کی اس درجہ پستی میں گر جائے۔ اور بفرض محال، ایسا ہو بھی گیا ہو تو پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ نوح نے اُسے عذاب کے وقت تک اپنے ساتھ کیوں رکھا؟ اگر کہا جائے کہ انھیں اس بارے میں علم نہ تھا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے اُنھیں اِس کی اطلاع کیوں نہ دی؟ اور اس غلاظت سے جان چھڑانے کی نصیحت کیوں نہ کی؟ اس الزام کو ایک اور زاویے سے دیکھیں تو بھی اسے سمجھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ نوح کے منکرین ایمان لانے والوں کو بے وقوف اور اراذل کہتے ہیں اور خود حضرت نوح علیہ السلام کو مجنون، کاذب اور گم راہ قرار دینے[15] اور باطل کے ہر ہتھیار سے مسلح ہو کر اُن پر پل پڑنے سے ذرا بھی نہیں چوکتے ہیں،[16] مگر اُن کی بیوی کے متعلق اس قدر بڑی بات پر وہ بالکل خاموش رہتے اور اس بنیاد پر اُن کے خلاف کوئی طوفان بدتمیزی نہیں اٹھاتے ہیں۔

جہاں تک خیانت کا تعلق ہے، تو یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ محض یہ لفظ اُن کی عورت پر اتنا بڑا الزام لگا دینے کے لیے ہرگز صریح نہیں ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ اصل میں امانت کے مقابلے میں آتا اور امین بنا دینے کے بعد کسی شخص پر جو اعتماد پیدا ہوتا ہے، اُس کے مجروح ہو جانے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مذکورہ آیت میں یہ بات تو بالکل صاف ہے کہ یہ نوح کی بیوی کی طرف سے اُن کے باہمی اعتماد کو مجروح کرنے پر آیا ہے، سوال صرف یہ ہے کہ ان دونوں کے ہاں اس سانحہ کے گزر جانے کی وجہ کیا ہوئی؟ اس کی وجہ بدچلنی تو کسی صورت نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ اس دعوے کے لیے جس درجے کا قرینہ چاہیے، وہ اشارے کی حد تک بھی کہیں کلام میں موجود نہیں ہے۔[17] لیکن آیت کے شروع میں آنے والے 'ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوا' (التحریم ۶۶: ۱۰) کے الفاظ، البتہ اس بات کا قرینہ ضرور ہیں کہ اس کی اصل وجہ اُن کی بیوی کی طرف سے سرزد ہونے والا کفر ہے۔[18] اور اس کے قرینہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں کفر کرنے والوں کو چونکہ متنبہ کرنا پیش نظر ہے کہ اُنھیں کسی بڑی شخصیت سے نسبت بھی خدا کے عذاب

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۵؎ منکرین کی یہ تمام ہذیات ان آیات میں دیکھ لی جا سکتی ہیں: ہود ۱۱: ۲۷۔ القمر ۵۴: ۹۔ ہود ۱۱: ۲۷۔ الاعراف ۷: ۵۹۔

۱۶؎ المومن ۴۰: ۵۔

۱۷؎ اس کی مثال میں سیدنا یوسف کا واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے جہاں 'ذٰلِکَ لِیَعۡلَمَ اَنِّیۡ لَمۡ اَخُنۡهُ بِالۡغَیۡبِ' (یوسف ۱۲: ۵۲) میں 'خیانت' کا لفظ جب اس معنی میں لیا گیا ہے تو اس کی وجہ سیاق وسباق میں صراحت سے بیان ہوا اُس کا قرینہ ہے۔

۱۸؎ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اُس عورت کی بدچلنی سے حضرت نوح کی اخلاقی برتری میں فرق آ سکتا تھا تو اُس کے کفر کرنے سے ایسا کیوں نہیں ہوا؟ عرض ہے کہ یہ اس لیے نہیں ہوا کہ کفر، چاہے اپنی حقیقت میں غیر اخلاقی امر ہو، مگر منکرین کے نزدیک یہ صرف علم اور عقیدے کا معاملہ، بلکہ اُن کے قومی تفاخر کی ایک نمایاں علامت تھا۔

سے نہیں بچا سکتی، اس لیے ضروری ہے کہ کفر ہی کے جرم پر بتایا جائے کہ اُن سے پہلے کے لوگوں کو بھی کسی بڑی نسبت نے کوئی فائدہ نہیں دیا۔ سو خیانت کے حقیقی معنی اور اس واضح قرینہ کی روشنی میں آیت کی اصل تفہیم کچھ یوں بنتی ہے:

کفر کرنے والوں کو نوح اور لوط کی عورتوں کی مثال دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ وہ ہمارے نیک بندوں کے عقد میں تھیں۔ اب یہ عقد چونکہ میاں اور بیوی کو ایک دوسرے کے لیے امین بناتا اور اس طرح اُن کے درمیان میں ایک طرح کا اعتماد پیدا کر دیتا ہے، اس لیے اُن نیک شوہروں کو اپنی عورتوں سے بڑی امید تھی کہ وہ اُن کی دعوت حق کو سبقت کرتے ہوئے قبول کریں گی اور اس کام میں اُن کی موید اور معاون بن جائیں گی، 'فَخَانَتٰهُمَا'، مگر اُنھوں نے اس اعتماد کو زبردست ٹھیس پہنچائی جب ایمان لانے کے بجائے کفر کا ارتکاب کیا۔ چنانچہ اس کفر کی وجہ سے پیغمبروں کے ساتھ اُن کی نسبتیں بھی اُنھیں کوئی فائدہ نہ دے سکیں اور وہ خدا کے عذاب کی گرفت میں آکر رہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ لفظ 'خیانت' کا بالکل وہی استعمال ہے جو ذیل کی اس آیت میں ہوا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ. ''ایمان والو، اللہ اور اس کے رسول سے خیانت نہ کرو۔'' (الانفال ۸: ۲۷)

مطلب ہے کہ تم لوگ ایمان کا قول و قرار کرنے کے بعد خدا اور اُس کے رسول کے ساتھ ایک عہد میں بندھ چکے اور اس معاملے میں امین قرار پا چکے ہو، چنانچہ اس کے تقاضوں کے خلاف جا کر اُن سے ہرگز خیانت نہ کرو۔

نوح کی بیوی چونکہ بدچلن تھی، اس لیے عذاب کی لپیٹ میں آنے والا شخص نوح کا حقیقی بیٹا نہیں تھا، اس استدلال کے دوسرے جز پر ہم صرف یہ عرض کریں گے کہ یہ کسی بھی صورت میں پہلے جز کا کوئی لازمی نتیجہ نہیں ہے۔ یعنی، اگر مان بھی لیا جائے کہ وہ عورت بدچلن تھی تو بھی اِس سے نوح کے بیٹے کی نسبت کا انکار نہیں ہوتا، اس لیے کہ اُس کی بدچلنی کے بعد یہ کہاں سے ثابت ہوا کہ اِس کے نتیجے میں اس کے ہاں اولاد بھی ہوئی تھی؟ اور دوسرے یہ کہ اگر اولاد ہوئی تھی تو وہ لازماً بیٹے ہی کی صورت میں ہوئی تھی؟ اور مزید یہ کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ جو شخص عذاب کی لپیٹ میں آیا، وہ اُسی عورت کا جنا ہوا بیٹا تھا؟ بلکہ اس بات کا بھی آخر کیا ثبوت ہے کہ وہ بیٹا اس کے عمل بد ہی کا نتیجہ تھا؟ سو بغیر کسی دقت کے سمجھ لیا جا سکتا ہے کہ ان حضرات کے استدلال اور ان کے دعویٰ کے درمیان میں بہت سے خلا ہیں جنھیں پر کرنے کے لیے ایک لمبی جست لگائی گئی اور اس کے لیے کئی باتیں خود سے فرض کر لی گئی ہیں۔

بہرحال، ہم اس بحث کو قرآن کے اس بیان پر ختم کرتے ہیں جس میں خداے علّام نے کسی اور کی زبان سے نہیں، بلکہ اپنی طرف سے تبصرہ کرتے ہوئے اُسے نوح کا بیٹا قرار دیا ہے۔ فرمایا ہے:

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

وَهِيَ تَجۡرِيۡ بِهِمۡ فِيۡ مَوۡجٍ كَالۡجِبَالِ وَنَادٰى نُوۡحُ ۨابۡنَهٗ. (ہود ۱۱: ۴۲)

''وہ کشتی پہاڑوں کی طرح اٹھتی ہوئی موجوں کے درمیان اُن کو لے کر چلنے لگی اور نوح نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔''

۵۔ آج کے سب انسان کس کی اولاد ہیں؟

عام راے یہ ہے کہ اِس وقت کی تمام انسانی آبادی نوح کے تین بیٹوں، سام، حام اور یافث کی اولاد ہے۔ اس راے کا ماخذ صرف اور صرف تورات کا بیان ہے اور یہ بیان فقط اُسی صورت میں صحیح قرار پا سکتا ہے جب دو باتیں مان لی جائیں: ایک یہ کہ طوفان کے نتیجے میں جب پورے کرۂ ارض پر موجود آبادی کو غرق کر دیا گیا ہو۔ اور دوسرے یہ کہ طوفان کے بعد صرف نوح کی اولاد ہی بچی ہو۔ ان میں سے پہلی بات کے بارے میں، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا، قرآن اور تورات سرے سے کوئی دعویٰ ہی نہیں کرتے۔ رہی دوسری بات تو اس کا بیان تورات میں موجود تو ضرور ہے، مگر چند شواہد ایسے ہیں جو اسے مان لینے میں رکاوٹ ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر، قرآن کی رو سے حضرت نوح کی بعثت صرف اُن کی اپنی قوم کی طرف ہوئی تھی اور اصول کے مطابق خدا کے اتارے ہوئے عذاب میں اُسے ہی ہلاک ہونا تھا، نہ کہ آدم کی پوری اولاد کو۔ اس میں چند ایمان والوں کے بارے میں تو صراحت سے بیان کر دیا گیا ہے کہ اُنھوں نے بھی نوح کی اولاد کے ساتھ اس طوفان میں نجات پائی، بلکہ تورات میں بھی ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جو اس بات کو مان لینے میں حائل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً آدم اور نوح کی پیدایش میں تقریباً گیارہ صدیوں کا زمانہ ہے اور آدم کے بیٹے، سیت اور نوح کے درمیان میں سات واسطے بھی ہیں کہ جن کی اپنی اولادیں بھی ضرور رہی ہوں گی اور اس پر مستزاد آدم کے دوسرے بیٹے، قائن سے چلنے والا ایک سلسلۂ نسل بھی ہے۔ لہٰذا اس قدر طویل زمانہ اور اس دوران میں وجود پانے والی آدم کی مختلف نسلیں، اگر ان کے ساتھ طوفان کا مقامی ہونا اور انسان کی طرف سے کی جانے والی ہجرتوں کا اِمکان بھی سامنے رکھا جائے تو یہ باور کرنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے کہ طوفان میں صرف نوح کی اولاد ہی بچی ہو گی۔ غرض یہ ہے کہ انسانی آبادی نوح کے تین بیٹوں کی اولاد ہے، اس راے کی بنیاد جن دو باتوں پر اٹھائی گئی ہے، وہ کسی طرح سے بھی ثابت نہیں ہوتیں۔

اگر پوچھا جائے کہ اس راے کے بارے میں قرآن کیا کہتا ہے؟ تو عرض ہے کہ اُس نے اِس معاملے میں کوئی واضح بات نہیں کی۔ البتہ، کوئی شخص ذیل کی آیت میں 'عَلٰۤى اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَكَ' کے الفاظ سے اشارے کی حد تک یہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

استدلال ضرور کرسکتا ہے[19] کہ غیر اولاد نوح سے بھی نسل انسانی آگے بڑھی ہوگی:

قِيۡلَ يٰنُوۡحُ اهۡبِطۡ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيۡكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَكَ. (ہود ۱۱: ۴۸)

''اے نوح، اتر جاؤ، ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اور برکتوں کے ساتھ، تم پر بھی اور اُن امتوں پر بھی جو اُن سے ظہور میں آئیں گی جو تمھارے ساتھ ہیں۔''

ہمارے نزدیک اس وقت کی نسل انسانی کے تین ممکنہ مصادر ہو سکتے ہیں: ایک نوح کی کشتی میں سوار تین بیٹے، سام، حام اور یافث۔ دوسرے اسی کشتی میں سوار دیگر مومنین۔ اور تیسرے مقام نوح سے دور بسنے والی آدم کی اولاد۔ جہاں تک اس راے کے صحیح ہونے کا تعلق ہے تو اس کی دلیل میں جس طرح اوپر مذکور ہوئے شواہد کو پیش کیا جا سکتا ہے، اسی طرح آج دنیا میں پائی جانے والی مختلف نسلوں کا تجزیہ بھی اس کی ایک دلیل ہو سکتا ہے۔

۶۔ سیدنا ابراہیم کیا واقعی حضرت نوح کی نسل سے ہیں؟

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سیدنا ابراہیم حضرت نوح کی اولاد میں سے ہیں، یہ بات بائیبل، قرآن مجید اور مسلمانوں کے علم میں بالکل واضح اور تاریخ کی ایک مانی ہوئی حقیقت ہے۔ اس پر آج کے دور میں اگر بعض اہل علم کی طرف سے ''انکشاف'' کے نام سے سوال نہ اٹھا دیا گیا ہوتا تو ہم کبھی بھی اس پر بات نہ کرتے۔ اس انکشاف میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ قرآن تورات کے برعکس، سیدنا ابراہیم کو حضرت نوح کے بجاے اُن کے کسی ساتھی کی اولاد قرار دیتا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم اصل حقیقت کو قرآن میں سے واضح کریں، ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کے اُس انداز کو واضح کر دیں جو تورات کے بیان کی اصلاح یا اُس کی تردید کرتے ہوئے وہ عام طور پر اپنایا کرتا ہے۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تورات کا بیان یہ ہے کہ اُنھوں نے معجزہ دکھاتے ہوئے جب اپنا ہاتھ باہر نکالا تو وہ کوڑھ سے برف کے مانند سفید تھا۔[20] قرآن نے جب یہ واقعہ بیان کیا تو بڑے ہی واضح انداز میں یہ کہتے ہوئے اس کی اصلاح کی: 'تَخۡرُجۡ بَيۡضَآءَ مِنۡ غَيۡرِ سُوۡٓءٍ'،[21] یعنی یہ ہاتھ بغیر کسی بیماری کے سفید ہوتا تھا۔ اسی طرح

---

[19] ہم نے اسے واضح دلیل کے بجاے اشارہ اس لیے قرار دیا ہے کہ 'عَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَكَ' کے الفاظ اس بات کے لیے ہرگز صریح نہیں ہیں کہ نوح کے تمام ساتھیوں سے امتیں پیدا ہوں گی، بلکہ اُن میں سے صرف بعض سے بھی اگر امتیں پیدا ہونا ہوتیں تو بھی اِن الفاظ کا استعمال بالکل درست ہوتا۔

[20] کتاب خروج ۴: ۶۔

[21] طٰہٰ ۲۰: ۲۲۔

تورات میں بیان ہوا ہے کہ خداوند نے چھ دن میں زمین و آسمان کی تخلیق کی اور ساتویں دن آرام کیا۔[22] قرآن نے یہ کہتے ہوئے بڑی صراحت سے اس کی تردید کی: 'وَمَا مَسَّنَا مِنۡ لُّغُوۡبٍ'[23] کہ ہمیں کوئی تکان لاحق نہیں ہوئی۔ بلکہ اگر کوئی غلطی بہت زیادہ سنگین ہو اور لوگوں میں اس کا عام رواج بھی ہو چکا ہو اور قرآن کو اس کے جواب میں واقعی کوئی انکشاف کرنا ہو تو اس کے لیے وہ محض اشارے کنایے میں اور محض ضمیروں کی دلالت سے بات نہیں کرتا، بلکہ انکشاف ہی کے طریقے سے اسے بیان کرتا ہے۔ مثال کے طور پر، یہود سیدنا مسیح علیہ السلام کو قتل کرنے کا دعویٰ کرتے تھے، انجیلوں میں بھی یہی کچھ نقل کر دیا گیا تھا، اور اسے کم و بیش ہر مسیحی فرقے میں مان لیا گیا، یہاں تک کہ نزول قرآن کے وقت اسے گویا ایک مسلمہ کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی؛ اس پر قرآن نے اصل حقیقت کا انکشاف کرتے ہوئے بتایا ہے اور دیکھ لیا جا سکتا ہے کہ کتنے زوردار طریقے سے بتایا ہے: 'وَمَا قَتَلُوۡهُ وَمَا صَلَبُوۡهُ وَلٰكِنۡ شُبِّهَ لَهُمۡ' (اُنھوں نے نہ اُس کو قتل کیا اور نہ اُسے صلیب دی، بلکہ معاملہ اُن کے لیے مشتبہ بنا دیا گیا)، یعنی پہلے اُن کی بات کی ہر دو پہلو سے تردید کی اور پھر ان کو جہاں سے غلطی لگی تھی، اس بنیاد کی بھی وضاحت کی، بلکہ پھر سے دہرا کر اصل بات کو موکد کیا: 'وَمَا قَتَلُوۡهُ يَقِيۡنًا'[24] کہ اِنھوں نے ہرگز اُس کو قتل نہیں کیا۔ غرض یہ ہے کہ تورات کے بیان کی تردید کرتے ہوئے قرآن کو اگر یہ بتانا ہوتا کہ وہ نوح کے بجائے کسی اور کی اولاد ہیں تو وہ اپنے معروف طریقے کے مطابق ہی بتاتا، نہ کہ اس طرح بتاتا کہ اسے جاننے کے لیے بڑے باریک اور منطقی استدلال کی ضرورت آن پڑتی۔

ہمارے نزدیک قرآن اس معاملے میں تورات کی پوری موافقت کرتا ہے اور واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ ابراہیم واقعتاً نوح ہی کی اولاد ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوۡحًا وَّاٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ. ذُرِّيَّةًۢ بَعۡضُهَا مِنۡۢ بَعۡضٍ. (آل عمران ۳: ۳۳-۳۴)

''اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ نے آدم اور نوح کو، اور ابراہیم اور عمران کے خاندان کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر (اُن کی رہنمائی کے لیے) منتخب فرمایا۔ یہ ایک دوسرے کی اولاد ہیں۔''

''ایک دوسرے کی اولاد ہیں''، اس جملے کا یہ مطلب، ظاہر ہے کہ نہیں لیا جا سکتا کہ ان میں سے ہر کوئی ایک

۲۲؎ خروج ۲۰: ۱۱۔

۲۳؎ ق ۵۰: ۳۸۔

۲۴؎ النساء ۴: ۱۵۷۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دوسرے کا باپ بھی ہے اور اولاد بھی، بلکہ اس کا ایک ہی مطلب بنتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ سب لوگ ایک ترتیب سے ایک دوسرے کی اولاد ہیں، یعنی نوح آدم کی اولاد ہیں، آل ابراہیم نوح کی اور آل عمران ابراہیم کی۔[۲۵]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۲۵؎ اس پر یہ سوال نہیں اٹھایا جاسکتا کہ اس میں تو آل ابراہیم کو نوح کی اولاد بتایا گیا ہے، نہ کہ ابراہیم کو، اس لیے کہ ابراہیم کی اولاد اگر نوح کی اولاد ہے تو خود ابراہیم تو بطریق اولیٰ نوح کی اولاد ہیں۔

نقد و نظر

طالب محسن

'جدید' مسلم

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کیا پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی امتی کے لیے 'جدید' ہونا جرم ہے؟

اگر کسی ایسے آدمی سے یہ سوال پوچھا جائے جو اپنے پرکھوں سے پائی دینی روایت پر عامل ہے اور اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جاری کردہ روایت سمجھتا ہے تو زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ اِس کا جواب اثبات میں دے۔

دین اسلام کے ساتھ وابستگی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ اِس کے علم و عمل کو اُس کی اصل صورت پر قائم رکھا جائے۔ اسلام کی اصل صورت کیا ہے؟ عملاً اِس سے مراد وہ عقائد، اوامر و نواہی اور مناسک ہیں جو کسی شخص یا گروہ نے اپنے آبا سے پائے ہیں اور وہ اِنھیں صحیح بھی سمجھتا ہے۔ چنانچہ بریلوی کے لیے اصل دین بریلویت ہے، دیوبندی کے لیے اصل دین دیوبندیت ہے، اہل حدیث کے لیے اصل دین اہل حدیثیت ہے اور اِسی طرح شیعہ کے لیے اصل دین شیعیت ہے۔ لٰہذا جب کوئی شخص کسی شخص کو متجدد کہتا یا کسی نئی فکر کو تجدد قرار دیتا ہے تو اِس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ ''اپنی روایت'' کو اصل کہہ رہا ہے۔ اِس نئی بات کو جدید قرار دے کر، ایک طرف وہ اپنے ضمیر کو اِس کی تردید کا جواز فراہم کرتا اور دوسری طرف اپنے ہم خیالوں سے داد وصول کرتا ہے، حالاں کہ جس نقطۂ نظر پر وہ خود کھڑا ہے، چند صدیاں پہلے وہ بھی ''جدید'' تھا۔ 'طرز جدید' اور 'انداز کہن' جیسے القاب کسی فرد کی نوک زبان اور نوک قلم پر اُس کے موقف کے اعتبار سے آتے ہیں۔ ہر فرد اپنے نقطۂ نظر کو صحیح اسلام قرار دیتا ہے اور اس کا یہ قول اُس کے اِس اعتماد کا

مظہر ہے کہ وہ حق پر ہے، ورنہ حقیقت اِس کے سوا کچھ نہیں کہ اُس کی راے آرا میں سے ایک راے ہے اور یہ راے درست بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔

یہ بات واضح رہے کہ اِس تحریر کا تعلق کارتجدید سے ہے، یعنی یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ تجدید کی ضرورت کیوں ہے؟ تجدد کا عنوان صرف اس فکر پر صادق آتا ہے جو غیر اسلام کو اسلام بنانے کی سعی کا نتیجہ ہو۔ کوئی ''غیر اسلام'' سے متاثر ہو اور اسلام کی قطع و برید کر کے اُسے اُس کے مطابق بنادے یا غیر اسلام کو لفاظی یا استدلال کے زور پر اسلام ثابت کر دے۔ اِس شخص کا کام کارتجدد ہے۔ لیکن اسلام کے اپنے نظام استدلال میں رہتے ہوئے نئی آرا قائم کرنا تجدد نہیں ہے، یہ تجدید ہے۔ تجدید کا یہ سلسلہ اسلام کے دور اول میں جاری ہوا اور قیاس یہی ہے کہ قیامت تک جاری رہے گا۔

کسی دینی موقف کے اصل ہونے کی دلیل کیا ہے؟

اِس سوال کا سادہ جواب یہ ہے کہ جو دینی موقف قرآن و سنت سے ماخوذ ہے، وہ اصل دین ہے، لیکن روایتی مکاتب فکر اپنے جواب کو کلام الٰہی اور سنت پیغمبر تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ اِس میں فقہا کے اجماع کا اضافہ کرتے ہیں۔ اور اِس اضافے کا نتیجہ یہ ہے کہ بالفعل اجماع دین کا ماخذ بن جاتا ہے اور قرآن و سنت محض اِس کے دینی استناد کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اِس اضافے کی ضرورت کیا ہے؟ تو اِس کا جواب علما یہ دیتے ہیں کہ فکر و عمل کی صحت کے لیے قرآن و سنت کے اُس فہم کا التزام بھی ضروری ہے جس کی یہ امت وارث ہے۔ جس فہم کو قبول عام حاصل ہے اور امت کے اعلیٰ اذہان جس کے قائل ہیں، اُس کی صحت کے انکار کی ہر دلیل باطل ہے۔

مذکورہ نکتے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ 'جدید' اور 'اصل' کی کش مکش حقیقت میں متوارث فہم اور نئے فہم کی کش مکش ہے۔ اگر اِس پر یہ سوال اٹھایا جائے کہ اِس متوارث فہم کو یہ تقدس کس دلیل پر حاصل ہے کہ وہی قرآن و سنت کا حقیقی، صحیح یا اصل مفہوم ہے اور نیا فہم اِس لیے مردود ہے کہ یہ متوارث فہم کے خلاف ہے اور اِس کے غلط ہونے کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ بزرگ اِس کے قائل نہیں تھے؟ تو اِس کے جواب میں بالعموم یہی کہا جاتا ہے کہ ہمارے اسلاف علم و تقویٰ کے جس اعلیٰ مقام کے حامل تھے، اُن کے کام کے بعد اب اصلاً کسی نئی فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ نئے فتاویٰ اِن کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چل کر بہ آسانی دیے جا سکتے ہیں۔

متوارث یا روایتی فہم کی حفاظت کا داعیہ پہلے پہل دور اول میں پیدا ہوا اور اِس کا ابتدائی ظہور احناف کی بعض آرا اور انداز فکر پر تنقید سے ہوا۔ یہ نقد اور رد نقد بجا طور پر اہل روایت اور اہل راے کی کش مکش کے نام سے موسوم ہے۔

احناف کی غیر معمولی فکری کامیابی کی وجہ سے ان کو امت مسلمہ میں ایک مسلمہ مقام حاصل ہے، لیکن اہل روایت کا حملہ موثر ثابت ہوا اور دور اول ہی میں احناف کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑی اور وہ اگر چہ ایک مخصوص تفہیم پر قائم تو رہے، لیکن روایات کے باب میں اُسی بات کے علم بردار بن گئے جو اِن کے مخالفین کہہ رہے تھے، اِس فرق کے ساتھ کہ روایات کے ساتھ فقہا کے اجماع کو بھی تقدس حاصل ہے۔ اور اِسے ''سبیل المؤمنین'' قرار دے کر نصوص کی تائید بھی فراہم کر دی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ لڑائی بے اصل نہیں تھی۔ نصوص کے فہم کی آزادی پر کوئی قدغن نہ ہو تو نئی اور من مانی تاویلات کی راہ کھل جاتی ہے اور امت اِس شدید احساس میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ اب دین کا وجود خطرے میں ہے۔ اِس کا پہلا حل یہ تھا کہ اُس روایت کو پکڑا جائے جو روایات اور آثار صحابہ و تابعین کی صورت میں محفوظ کی جا رہی تھی اور اسے صحت استنباط کا معیار قرار دیا جائے۔ لیکن مشکل یہ ہوئی کہ ابتدائی چار صدیاں جن میں یہ ریکارڈ مدون ہوا، فقہا کا کام اپنا لوہا منوا چکا تھا۔ لہٰذا فقہا کی اُن آرا کو ماننے پر مجبور ہونا پڑا جن کی صحت اور افادیت مسلم تھی اور اِسے 'اجماع' جیسے لفظ کی چھتری فراہم کی گئی اور اِس طرح محض روایت کے بجائے قیاس و اجتہاد پر مبنی آرا بھی دین کی سند سے سرفراز ہو گئیں۔

قیاس و اجتہاد جن کی بنا پر نئی آرا قائم ہوتی ہیں، اِن کا خاتمہ کیوں ممکن نہیں؟ اِس کے متعدد وجوہ ہیں۔ جب کسی متن یا واقعے کی کوئی تشریح یا تعبیر ہو جاتی ہے تو اِس پر سوالات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ لہٰذا نئی آرا وجود میں آتی ہیں۔ اِس سلسلے کو روکنا ممکن نہیں۔ نہ کسی متن کے فہم کے عمل کو اور نہ کسی واقعے کی تعبیر نو کے عمل کو۔

پھر نئے حالات ہیں۔ نئے حالات نئے فتاویٰ کا تقاضا کرتے ہیں۔ نئے مسائل متن اور واقعات کی نئی تفہیم کی ضرورت پیدا کر دیتے ہیں۔ انسانی ذہن کے لیے جب نئے افق وا ہوتے ہیں تو وہ اُسی متن اور اُسی واقعے کو نئے تناظر میں رکھ کر دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے جس کے بارے میں وہ ایک مسلمہ رائے کا حامل رہ چکا ہے۔

جب بھی کوئی نئی رائے پیدا ہوتی ہے تو اِس کا سبب خارج میں آنے والی تبدیلیاں ہی نہیں ہوتیں، بلکہ اِس کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ ہر فکر کو تنقید کی نگاہ سے دیکھنے والے اس کے اندر اور باہر پیدا ہو جاتے ہیں اور یہ تنقیدی نگاہ اس غلطی یا خلا یا کمی کو پکڑ لیتی ہے جو اِس فکر میں ہوتی ہے اور اس طرح نئی رائے قائم کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح ہر فکر جب عمل کی دنیا سے متعلق ہوتی ہے تو تجربہ اُس کی کمی یا غلطی کو نمایاں کر دیتا ہے۔ چنانچہ اصلاح فکر کا تقاضا نئی رائے کے وجود میں آنے کا جواز بن جاتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

پھر کوئی فکر بھی مقابل افکار کے ٹکراؤ سے محفوظ نہیں۔ یہ ٹکراؤ ہر فکر کے ماننے والوں کو ایسے سوالات سے دوچار کر دیتا ہے کہ نظرثانی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اِس ٹکراؤ کے باوجود ہر مکتب فکر تبدیلی کی راہ میں بند باندھنے کی کوشش ضرور کرتا ہے، لیکن اِس طرح کی کوئی کوشش کبھی بھی کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکی، البتہ ایک کش مکش ضرور برپا ہوتی ہے، لیکن پرانی رائے پر اصرار کرنے والے بالآخر نئی رائے کو بشرط صحت اُس کی جگہ دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

کوئی مکتب فکر بھی تبدیلی کے اِس عمل سے محفوظ نہیں رہا۔ احناف، شوافع، حنابلہ اور مالکیہ، اِسی طرح اہل کلام اور اہل تصوف اور اِسی طرح دین کو ایک کل کے طور پر دیکھنے والے ابن تیمیہ، غزالی اور شاہ ولی اللہ جیسے مفکرین کے متبعین بھی ہمارے زمانے تک آتے آتے کئی تبدیلیوں سے گزر چکے ہیں۔

کیا یہ ممکن ہے کہ قرآن کی ایسی تفسیر کر دی جائے کہ جس سے اختلاف کا کوئی امکان باقی نہ رہے اور فقہ کے احکام اِس طرح متعین کر دیے جائیں کہ اختلاف کرنا محض حماقت قرار پائے؟ امت کی فکری تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ کیا یہ ممکن تھا کہ امت دور صحابہ یا دور اول ہی کے فکر و عمل کو بے کم و کاست اپنائے رکھتی اور فکر و عمل میں کسی تبدیلی کو راہ نہ دیتی؟ تبدیلی کے عمل کے مطالعے ہی سے بادنیٰ تعمل یہ واضح ہے کہ ہر تبدیلی اپنا کوئی نہ کوئی جواز رکھتی ہے۔

ہماری ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ انحرافات اور بدعات کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یا ہر نئی تفسیر اور ہر نیا تفقہ صحت کا حامل ہوتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ صحت فکر کا معیار کیا ہے؟ اِسے طے کیے بغیر کوئی فتویٰ کارگر نہیں ہو سکتا۔ کسی فکر کو تجدد کی گالی دے کر اس کی راہ روکنا ممکن نہیں ہے جب تک اس فکر میں اگر کوئی انحراف ہے تو اس کو نمایاں اور ثابت نہ کر دیا جائے۔

نکتہ وہی ہے کہ وہ کیا حدود و شرائط ہوں جو صحیح فہم کی ضمانت ہوں؟ کیا جو بات روایات میں ہے، وہ معیار ہے؟ کیا دور اول میں پیدا ہو جانے والا عمومی اتفاق پیمانہ ہے یا قرآن مجید کا لغت و نحو اور سیاق و سباق جیسے وسائل سے سمجھنے کا طریقہ کفایت کرتا ہے؟

اِس کا طریق کار یہ ہے کہ عقل و نقل کے دلائل سے پہلے یہ متعین کیا جائے کہ دین کے ماخذ کیا ہیں؟ پھر یہ طے کیا جائے کہ یہ ماخذ کس طرح باہم مربوط ہیں؟ پھر یہ واضح کیا جائے کہ اِن کے فہم اور ان سے استنباط کا طریق کیا ہوگا؟ اور پھر عقل و نقل کے دلائل سے یہ ثابت کیا جائے کہ یہی طریق درست ہے۔ اِسی طرح انسان جس کے لیے یہ دین ودیعت ہوا ہے، جب تک اُس کی ذاتی اور سماجی ضروریات متعین نہ ہوں اور پھر دین کا اُن سے تعلق واضح نہ کیا جائے،

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

فہم دین کا کوئی منصوبہ مکمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ امت کا کوئی ایک فرد یہ تمام کام نہیں کر سکتا۔ امت کے تمام افراد کار مل کر ہی یہ ضرورت پوری کر سکتے ہیں۔

دور جدید کیا ہے؟ یہ سماج اور فرد کی سطح پر بڑی تبدیلیوں کا نام ہے۔

جدید ریاست: اِس کی بنیاد اور اہداف اُس ریاست سے بالکل مختلف ہیں جن پر خلافت راشدہ قائم ہوئی تھی۔ یہ ریاست ان اہداف اور مبادی سے بھی مختلف ہے جو بنو امیہ، بنو عباس اور سلاطین کی ریاستوں کے رہے ہیں۔ شہریوں کے حقوق کا تصور ہی نیا ہے، اس وجہ سے ریاست اور فرد کے تعلق کی نوعیت ہی بدل کر رہ گئی ہے۔ جدید قانون کی اخلاقیات اور وجود پذیری کا عمل اس قانون سے مختلف ہے جو ہمارے ہاں صدیوں تک رائج رہا۔

سماج کی تعمیر جن اصولوں پر ہوگئی ہے، اس کا تعلق اب مذہب سے کسی بھی معاشرے میں عنقا ہے۔ فرد کا اپنی ذات اور اپنے خاندان سے تعلق بھی نیا ہے اور پرانی تمام نسبتیں اپنی بقا کی جنگ ہارتی جا رہی ہیں۔ مرد کی برتری کے اسباب ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ بیوی کی ذمہ داریاں سکڑتی جا رہی ہیں۔ باپ کا رول محض ایک مددگار کے روپ میں ڈھلتا جا رہا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

امت مسلمہ صدیوں تک روحانی اہداف کو آئیڈیل بنائے ہوئے تھی۔ یہ سب کچھ اب اپنی تاثیر کھو چکا ہے۔ اہل مذہب جب دین کی ایمانیات، دین کے اہداف، دین کے مطلوب فرد اور دین کی مطلوب ریاست کو بیان کرتے ہیں تو وہ زمین ہی موجود نہیں ہے جو اِس تخم کے قرار و نمو کے لیے اپنی گود پیش کرے۔

'جدید' مسلم اِس دنیا میں اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے۔ یہ اُس کے اختیار میں نہیں کہ وہ اپنے گرد کی دنیا کو بدل کر پرکھوں کا معاشرہ واپس لے آئے۔ اسے ان سوالات کے جواب چاہییں:

پہلا یہ کہ اس کا دین صرف فقہ کے احکام اور عبادت کے طریقوں تک محدود ہے یا اس کے مطالبے اس سے زیادہ ہیں؟

دوسرا یہ کہ عورت کے لیے جو امکانات پیدا کر دیے گئے ہیں، کیا یہ دین کے خلاف ہوا ہے یا دین کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟

تیسرا یہ کہ دنیا فرد کی رائے اور عمل کی جس آزادی کی علم بردار ہے، کیا یہ درست ہے یا ''حق'' کا نفاذ ہر حال اور ہر طریقے سے کرنا ضروری ہے؟

چوتھا یہ کہ ریاست کے نظریاتی اہداف کا باب بند ہو چکا۔ دینی ریاست کا قیام صرف مذہبی جبر کے لیے اختیار

حاصل کرنے کی کاوش ہے۔ کیا اسلامی ریاست موجود ریاست کے دروبست کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتی ہے؟

پانچواں یہ کہ معیشت کی اصل سرگرمیاں اب فرد سے مختلف اداروں یا کاروباری کمپنیوں کے ہاتھ میں چلی گئی ہیں؟ زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت کے تمام طریقے نئے ہیں۔ روپے کی گردش کی صورتیں بدل گئی ہیں۔ معیشت ہی اب سماج کی بیخ و بن اور برگ و ثمر کا تعین کر رہی ہے۔ کیا فقہ کے ابواب بیع و شرا کفایت کریں گے؟ کیا ہمارا دینی ذہن معیشت کے نئے وا ہونے والے افقوں کا ادراک رکھتا اور اِس میں قانون سازی کے لیے صحیح مہارت کا حامل ہے؟

تعلیم نے جو صورت اختیار کر لی ہے۔ علم جس رنگ و روپ میں معاشروں کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے، کیا اہل اسلام کو اِس کا ادراک ہے اور کیا اُن کے روایتی نظام تعلیم کا فلسفہ اور اہداف اتنی جان رکھتے ہیں کہ نئی تعلیمی اور علمی بادمخالف کا مقابلہ کر سکے؟ کیا وہ خود اِک سیل ہے جو اِس سیل کو تھام لے؟

ہمارا روایتی علم بہت سی چیزوں کو جواز فراہم کرنے کا کام کر رہا ہے۔ اِس کے لیے اُس کے پاس فن افتا کا ہتھیار ہے۔ وہ اس پورے کینوس کو دیکھے بغیر فتاویٰ دے رہا ہے۔ جدید اہل علم کا ایک طبقہ جدید دور کی کامیابیوں کو عین اسلام کے مقاصد سے ہم آہنگ سمجھتا ہے اور فقہ اور حدیث میں پائی جانے والی عدم مناسبتوں کو دور کرنے کو ضروری سمجھتا ہے۔ دوسرا طبقہ مذہب کو فرد کا معاملہ قرار دیتا ہے اور دنیا کے امور کو انسانی عقل سے حل کرنے کا قائل ہے۔ ذرا تامل سے دیکھیں تو تینوں طبقات عملاً ایک ہی موقف پر کھڑے ہیں۔

اِس فضا میں جدید اور روایتی کا فرق محض لباس کا فرق ہے۔ کار تجدید یہ ہو گا کہ اسلام کے یہ تمام خادم اُن سوالوں کے جواب دیں جو اِس وقت اہل اسلام کو درپیش ہیں۔ ہم دین سازی اور غیر اسلام کو اسلامیانے کی ہر کاوش کو مردود قرار دیتے ہیں، لیکن دور حاضر کے چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے جن مجددین کی ضرورت ہے، اس کا شعور تو ہمیں ہونا چاہیے۔

www.javedahmedghamidi.org
www.al-mawrid.org

محمد حسن الیاس

قربانی سے پہلے بال اور ناخن نہ کاٹنا

جناب جاوید احمد غامدی کے موقف پر بعض اشکالات کا جائزہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک روایت میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کا ارادہ رکھنے والے غیر حاجیوں کو ذی الحجہ کی ابتدا سے بال اور ناخن نہ کاٹنے کی تلقین فرمائی ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

إِذَا رَأَيْتُمْ هِلَالَ ذِي الْحِجَّةِ وَأَرَادَ أَحَدُكُمْ أَنْ يُضَحِّيَ فَلْيُمْسِكْ عَنْ شَعْرِهِ وَأَظْفَارِهِ. (مسلم، رقم ۱۹۷۷)	''جب تم لوگ ذوالحجہ کا چاند دیکھو اور تم میں سے کوئی شخص قربانی کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ اپنے بالوں اور ناخنوں کو نہ کاٹے۔''

استاذ مکرم جناب جاوید احمد غامدی نے اِس روایت کو اپنی کتاب ''میزان'' میں قبول کیا ہے اور قربانی کا قانون بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

> ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے البتہ، اِس کے بارے میں چند باتوں کی وضاحت فرمائی ہے:
>
> اول یہ کہ قربانی کے مہینے میں قربانی کرنے والے نذر کی قدیم روایت کے مطابق قربانی سے پہلے نہ اپنے ناخن کاٹیں گے اور نہ بال کتروائیں گے۔'' (۴۰۸)

صاحب ''میزان'' کے اِس موقف پر اُنھی کے اصولوں کی روشنی میں بعض اصحاب علم نے درج ذیل سوالات

اٹھائے ہیں:

اول، کسی ایسی خبر واحد کو کیسے قبول کیا جا سکتا ہے جو دین میں ایک نیا اور مستقل حکم بیان کر رہی ہو؟

دوم، بال اور ناخن نہ کاٹنے کی پابندی حالت احرام میں مشروع ہے، یہ روایت احرام کی بعض پابندیوں کو غیر حاجیوں تک کیوں پھیلا رہی ہے؟

سوم، روایت کے الفاظ اِس ہدایت کے وجوب کا تقاضا کر رہے ہیں، پھر صاحب ''میزان'' نے اِسے لازمی ہدایت کے طور پر قبول کیوں نہیں کیا؟

چہارم، صاحب ''میزان'' نے نذر کی جس قدیم روایت کا حوالہ دیا ہے، اُس قدیم روایت میں ناخن تراشنے کا ذکر کیوں موجود نہیں ہے؟

پنجم، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تلقین صحابہ کے دور میں شائع و ذائع کیوں نظر نہیں آتی اور ایسے نادر عمل کو عبادات کے باب میں کیسے قبول کیا جا سکتا ہے؟

ششم، سیدنا عائشہ سے مروی ایک دوسری روایت میں یہ صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہدی کے جانور حرم میں بھجوانے کے باوجود احرام کی کوئی پابندی اختیار نہیں کرتے تھے، جب کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت اِس کے برخلاف بعض پابندیاں عائد کر رہی ہے؟

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ وہ سوالات ہیں جو ''میزان'' میں اِس روایت کو قبول کرنے پر اٹھائے جاتے ہیں۔ اِس آرٹیکل میں ہم کوشش کریں گے کہ ان سوالات کا استاذ مکرم جاوید احمد غامدی صاحب کے فہم دین کے اصولوں کی روشنی میں جائزہ لیں، اور ''میزان'' میں اِسے قبول کرنے کی وجوہات کو سمجھیں۔ اِس لیے اِن سوالات پر غور و فکر سے پہلے ضروری ہے کہ اسلام میں عبادات سے متعلق صاحب ''میزان'' کے چند تصورات کو پیش نظر رکھا جائے۔

پہلا، یہ کہ ہر عبادت چند اعمال پر مشتمل ہوتی ہے۔ مثلاً نماز قیام، رکوع اور سجدے سمیت کئی اعمال کا مجموعہ ہے۔ یہ اعمال اپنی ذات یا واقعیت میں محض حرکات ہیں، یعنی، قیام صرف کھڑا ہو جانا ہے۔ انسان کھڑے ہونے کا یہ عمل زندگی میں کئی مواقع پر کرتا ہے، لیکن نماز میں قیام محض کھڑے ہو جانے کا نام نہیں، بلکہ یہ خدا کے سامنے فریاد کناں بن کر حاضر ہونے کی علامت ہے۔ یہ علامت اپنی حقیقت سے متعلق ہو کر ایک مقصد متعین کرتی ہے۔ نماز کے یہ سب اعمال انسان کے عملی وجود کی رعایت سے پرستش اور اطاعت کی علامات ہیں۔ اِن علامات کو وضع کرنے کا مقصد خدا کی یاد دہانی اور اُس سے تعلق کے احساس کو زندہ رکھنا ہے۔ قرآن مجید میں نماز کے اِسی مقصد کو بیان کرتے

ہوئے ارشاد ہوا ہے:

''سو میری ہی بندگی کرو اور میری یاد کے لیے نماز کا اہتمام رکھو۔'' (طٰہٰ ۲۰: ۱۴)

یہی معاملہ دیگر مراسم عبودیت کا ہے۔ وہ اپنے اجزا میں اگرچہ متعین حرکات ہیں، لیکن یہ اعمال کسی مقصد کی علامت کے طور پر وضع کیے گئے ہیں۔

دوسرا پہلو اِن عبادات کو ادا کرنے کی نوعیت کا ہے۔ اسلام میں عبادات کی دو ہی نوعیتیں ہیں: پہلی، یہ کہ وہ اپنے حدود و شرائط کے ساتھ لازم کر دی گئی ہیں۔ اور دوسری، یہ کہ اُن کی ادائیگی ہماری صواب دید پر ہے۔ قرآن مجید نے اِس بات کی تصریح کر دی ہے کہ تمام عبادات اپنے حدود و شرائط کی رعایت سے تطوعاً بھی ادا کی جا سکتی ہیں، یعنی نماز اگرچہ پانچ اوقات میں لازم ہے، لیکن ہم اِن اوقات کے علاوہ اپنی خواہش سے کسی بھی وقت نفل نماز ادا کر سکتے ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

''اور جس نے اپنے شوق سے نیکی کا کوئی کام کیا، اللہ اُسے قبول کرنے والا ہے، اُس سے پوری طرح باخبر ہے۔''
(البقرہ ۲: ۱۵۸)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عبادات، خواہ لازم ہوں یا نفل، اُنھیں تطوعاً ادا کرتے ہوئے اُن کے حدود و شرائط کا اہتمام ضروری ہے۔ مثلاً لازمی نمازوں میں جس طرح وضو کی پابندی ہے، نفل نماز ادا کرتے وقت بھی یہ پابندی برقرار رہے گی۔ اِسی طرح بعض عبادات جو مخصوص مقام اور اوقات میں مشروع ہیں، جیسے حج، اُسے تطوعاً بھی صرف اُنھی اوقات اور مقامات پر ادا کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا عبادات کے حوالے سے جو دوسرا پہلو ذہن نشین رہنا چاہیے، وہ یہ کہ تمام عبادات اپنے حدود و شرائط کی رعایت سے تطوعاً بھی ادا کی جا سکتی ہیں۔

عبادات کے حوالے سے جو تیسرا پہلو سامنے رہنا چاہیے، وہ یہ ہے کہ تمام مراسم عبودیت جس طرح اعمال کے مجموعوں اور متعین ترتیب کے ساتھ دین میں جاری کیے گئے ہیں، اُسی طرح یہ اعمال اپنے اجزا اور انفرادی حیثیت میں بھی عبادت ہی کے مشروع اعمال ہیں۔ مثلاً قیام، جس طرح رکوع اور سجدے کے ساتھ مل کر نماز میں عبادت کا عمل بنتا ہے، اُسی طرح وقوف عرفہ کے موقع پر یہی قیام اپنی انفرادی حیثیت میں بھی پوری عبادت سمجھا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے نماز کے دوسرے اجزا کو انفرادی طور پر ادا کرنے پر فرمایا ہے:

''اُن کو جب خداے رحمٰن کی آیتیں سنائی جاتی تھیں تو سجدے میں گر پڑتے اور روتے جاتے تھے۔''
(مریم ۱۹: ۵۸)

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف یہ کہ نماز میں قیام اور رکوع کے بعد سجدے کیے، بلکہ قرآن مجید کی تلاوت کے دوران بھی آپ سجدے کیا کرتے تھے۔ اِسی طرح حج بہت سے اعمال کو ایک ترتیب سے ادا کرنے کی عبادت ہے۔ طواف اِنھی اعمال میں سے ایک عمل ہے، لیکن جس طرح طواف، مناسک حج کا حصہ بن کر ایک عبادت ہے، اُسی طرح اپنی انفرادی حیثیت میں بھی عبادت کا مکمل عمل ہے۔ لہٰذا عبادات کے اعمال کے بارے میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ جس طرح اِنھیں دوسرے اعمال کے مجموعے میں ایک خاص ترتیب سے ادا کیا جاتا ہے، اُسی طرح یہ انفرادی حیثیت میں بھی عبادت ہی کے مشروع اعمال ہیں۔

عبادات کے اِن تینوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب ہم اصل سوالات پر غور کرتے ہیں۔ پہلا سوال یہ تھا کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی یہ روایت دین میں ایک مستقل عمل اور نیا حکم بیان کر رہی ہے۔ ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کا ارادہ رکھنے والے لوگوں کو جس عمل کی تلقین فرمائی ہے، عبادت کا وہ عمل اپنی ذات میں پہلے سے مشروع ہے۔ یہ مشروع عمل نہ صرف یہ کہ حج میں جاری ہے، بلکہ حج میں بھی اصلاً نذر کی جس قدیم روایت سے اخذ کیا گیا ہے، اُس کے شواہد بھی الہامی صحائف میں بکثرت موجود ہیں۔ اِن شواہد کے مطابق نذر کے اِن اعمال کا مقصد خود کو خدا کی رضا کے لیے اُس کے سپرد کر دینا ہے۔ قدیم الہامی تہذیب میں اِس مقصد کی علامت کے طور پر تین عبادات جاری تھیں: نذر کی پہلی عبادت، خدا کے نام پر جانور کو ذبح کرنا تھا۔ دوسری، اِس ذبیحے کو لے کر قربان گاہ کے پھیرے لگانا اور تیسری، اپنا سر منڈوانا اور ناخن تراشنا تھا۔ عبادت کے یہ تینوں اعمال جس طرح ایک مجموعے کی صورت میں متعین ترتیب سے ادا کیے جاتے تھے، اُسی طرح اپنی انفرادی حیثیت میں بھی مشروع تھے۔ چنانچہ الہامی صحائف میں جہاں اِنھیں ایک ترتیب سے ادا کرنے کی ہدایت کی گئی ہے، وہیں نذر کے یہ اجزا انفرادی طور پر ادا کرنے کی روایت کے طور پر بھی جاری تھے۔ بائیبل میں نذر کے اِن منفرد اعمال کو ایک مجموعے کی صورت میں ادا کرنے کی ہدایات اِس طرح نقل ہوئی ہیں:

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

”اور اس کی نذرات کی منت کے دنوں میں اس کے سر پر استرا نہ پھیرا جائے جب تک وہ مدت جس کے لیے وہ خداوند کا نذیر بنا ہے پوری نہ ہو تب تک وہ مقدس رہے اور اپنے سر کے بالوں کو بڑھنے دے۔“

”وہ اپنی نذرات کی مدت تک خداوند کے لیے مقدس ہے۔“

”اور اگر کوئی آدمی ناگہان اس کے پاس ہی مر جائے اور اس کی نذرات کے سر کو ناپاک کر دے تو وہ اپنے پاک ہونے کے دن اپنا سر منڈوائے، یعنی ساتویں دن سر منڈوائے۔“

''اور آٹھویں روز دو قمریاں یا کبوتر کے دو بچے خیمۂ اجتماع کے دروازہ پر کاہن کے پاس لائے۔''

''اور جب نذیر اپنی نذرات کے بال منڈوا چکے تو کاہن اس کے مینڈھے کا ابالا ہوا شانہ اور ایک بے خمیری روٹی میں سے اور ایک بے خمیری کلچہ لے کر اس نذیر کے ہاتھوں پر ان کو دھرے۔''

''اور کاہن ایک خطا کی قربانی کے لیے اور دوسرے کو سوختنی قربانی کے لیے گذرانے اور اس کے لیے کفارہ دے، کیونکہ وہ مردہ کے سبب سے گنہگار ٹھہرا ہے اور اس کے سر کو اسی دن مقدس کرے۔''

''پھر وہ نذیر خیمۂ اجتماع کے دروازہ پر اپنی نذرات کے بال منڈوائے اور نذرات کے بالوں کو اس آگ میں ڈال دے جو سلامتی کی قربانی کے نیچے ہو۔''

''پھر خداوندان کو ہلانے کی قربانی کے طور پر خداوند کے حضور ہلائے۔ ہلانے کی قربانی کے سینہ اور اٹھانے کی قربانی کے شانہ کے ساتھ یہ بھی کاہن کے لیے مقدس ہیں اس کے بعد نذیر مے پی سکے گا۔'' (گنتی ۶)

گنتی کے چھٹے باب میں جس طرح نذر کی قدیم روایت کے تمام اجزا کو ایک مجموعے میں خاص ترتیب سے ادا کرنے کی ہدایات دی گئیں، اُسی طرح بائیبل کے دوسرے مقامات پر نذر کے ان اجزا پر انفرادی طور پر عمل کی روایت بھی نقل ہوئی ہے۔ چنانچہ جانور کی قربانی کی صورت میں نذر کی صرف ایک عبادت ادا کرنے کے حوالے سے بائیبل میں ہے:

''اور ساتویں سبت کے دوسرے دن تک پچاس دن لینا۔ تب تم خداوند کے لیے نذر کی نئی قربانی گردانا۔''

(احبار ۲۳)

''اور اگر وہ منت کسی ایسے جانور کی ہے جس کی قربانی لوگ خداوند کے حضور چڑھایا کرتے ہیں تو جو جانور کوئی خداوند کی نذر کرے وہ پاک ٹھہرے گا۔'' (احبار ۲۷)

''اور فرماں روا سوختنی قربانیاں اور نذر کی قربانیاں اور تپان عیدوں اور نئے چاند کے وقتوں اور سبتوں اور بنی اسرائیل کی تمام مقررہ عیدوں میں دے گا۔ اور خطا کی قربانی اور نذر کی قربانی اور سوختنی قربانی اور سلامتی کی قربانیاں بنی اسرائیل کے کفارے کے لیے تیار کرے گا۔'' (حزقی ایل ۴۵)

''تو اِن چیزوں کی نذر کی قربانی کا چڑھاوا خداوند کے پاس لانا، وہ کاہن کو دیا جائے گا، وہ اُسے مذبح کے پاس لائے۔'' (احبار ۲)

جانور کی قربانی کی طرح سر منڈوانا اور ناخن تراشنا بھی اپنی انفرادی حیثیت میں نذر کی عبادت کے طور پر مشروع عمل تھا۔ اِسے بائیبل میں بدن کی قربانی قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ مختلف کتابوں میں ہے:

’’پس اَے بھائیو۔ مَیں خُدا کی رحمتیں یاد دِلا کرتُم سے اِلتماس کرتاہُوں کہ اپنے بَدَن اَیسی قُربانی ہونے کے لِیے نذر کروجو زِندہ اور پاک اور خُدا کو پسندِ یدہ ہو۔ یہی تُمہاری معقُول عِبادت ہے۔‘‘ (رومیوں۱۲)

’’اوراس وقت خداوندرب الافواج نے رونے اور ماتم کرنے اور سرمنڈوانے اورٹاٹ سے کمر باندھنے کاحکم دیا تھا۔‘‘ (یسعیاہ۲۲)

’’وہ تیری سبب سے سرمنڈائیں گے اور ٹاٹ اوڑھیں گے۔ وہ تیرے لیے دل شکستہ ہوکر روئیں گے اور جاں گدازنوحہ کریں گے۔‘‘ (واعظ۲۷)

بائیبل کی درج بالا تصریحات سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ قدیم الہامی روایت میں نذر کی یہ تینوں عبادات جس طرح ایک مجموعے کی صورت میں مخصوص ترتیب سے ادا کی جاتی تھیں، اُسی طرح اِنھیں انفرادی طور پر ادا کرنے کی روایت بھی جاری تھی۔ اِن تصریحات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اگر جانور کو ذبح کرنے کے ساتھ، سر منڈوانے اور ناخن تراشنے کی دوسری عبادت پر ایک ساتھ عمل پیش نظر ہوتو اِس صورت میں جانور کی قربانی تک سر کے بال اور ناخن بڑھنے دیے جائیں گے اور جانور کی قربانی کے بعد ہی نذر کی اِس دوسری روایت پر عمل کیا جائے گا اور سر منڈوایا اور ناخن تراشے جائیں گے۔

دین ابراہیمی کی روایت میں حج کے موقع پر نذر کی اِنھی تینوں عبادات کو جمع کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ مناسک حج میں جہاں جانور کی قربانی اور اُسے معبد کے پھیرے لگوانے کی علامت کے طور پر طواف اور سعی جاری ہے، وہیں قربانی سے پہلے بال اور ناخن نہ تراشنے اور جانور ذبح کرنے کے بعد ہی سرمنڈوانے کی روایت بھی موجود ہے۔ اِس عمل کی حقیقت اور فلسفہ کیا ہے؟ صاحب ’’میزان‘‘ نذر کے اِن اعمال کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’قربانی کا مقصد اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری ہے۔ ہم اپنی جان کا نذرانہ قربانی کے جانوروں کو اُس کی علامت بنا کر بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں تو گویا اسلام واخبات کی اُس ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں جس کا اظہار سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی سے کیا تھا۔‘‘ (میزان ۴۰۶)

’’اِس لحاظ سے دیکھیے تو قربانی پرستش کا منتہاے کمال ہے۔ اپنا اور اپنے جانور کا منہ قبلہ کی طرف کر کے ’بِسۡمِ اللّٰہِ، وَاللّٰہُ أَکۡبَرُ‘ کہہ کر، ہم اپنے جانوروں کو قیام یا سجدے کی حالت میں اِس احساس کے ساتھ اپنے پروردگار کی نذر کر دیتے ہیں کہ یہ درحقیقت ہم اپنے آپ کو اُس کی نذر کر رہے ہیں۔‘‘ (میزان ۴۰۴)

’’یہی نذر اسلام کی حقیقت ہے، اِس لیے کہ اسلام کے معنی ہی یہ ہیں کہ سر اطاعت جھکا دیا جائے اور آدمی اپنی عزیز سے عزیز متاع، حتیٰ کہ اپنی جان بھی اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے۔ قربانی، اگر غور کیجیے تو اِسی حقیقت کی تصویر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہے۔''(میزان ۴۰۴)

''قربانی جان کا فدیہ ہے اور سر کے بال مونڈنا اِس بات کی علامت ہے کہ نذر پیش کر دی گئی ہے اور اب بندہ اپنے خداوند کی اطاعت اور دائمی غلامی کی اِس علامت کے ساتھ اپنے گھر لوٹ سکتا ہے۔ یہ دین ابراہیمی کی ایک قدیم روایت ہے۔''(میزان ۳۷۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نذر کی اِس قدیم روایت کے تمام اجزا کو جس طرح حج میں جاری کیا، اُسی طرح اِس عبادت کے ایک جز، یعنی جانور کی قربانی کو عیدالاضحیٰ میں جاری فرمایا ہے۔ عیدالاضحیٰ میں جانور کی قربانی کی یہ سنت اجماع اور تواتر عملی سے منتقل ہوئی ہے اور پوری امت میں جاری ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حج میں جس طرح نذر کی تینوں روایات پر عمل کیا جاتا ہے، کیا عیدالاضحیٰ میں جانور کی قربانی کی عبادت ادا کرتے ہوئے، نذر کی کوئی دوسری عبادت کی جاسکتی ہے؟ قرآن مجید نے اِس حوالے سے تمام عبادات کے بارے میں یہ بات تصریح کر دی ہے کہ وہ اپنے حدود و شرائط کی رعایت سے تطوعاً بھی ادا کی جاسکتی ہیں۔ ہمارے نزدیک ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی اِس روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن مجید کی اِسی اجازت کے تحت حج میں جاری نذر کی اِس قدیم عبادت کو اپنے حدود و شرائط کے ساتھ تطوعاً ادا کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں اور روایت میں قربانی تک بال اور ناخن نہ تراشنے کی تلقین، دونوں عبادات پر ایک ساتھ عمل کرنے کے آداب کا بیان ہے۔ حج میں چونکہ اِن آداب کا التزام احرام باندھنے کے بعد ہی شروع ہو جاتا ہے، جب کہ غیر حاجی کے لیے دین میں اِس کے لیے کوئی مخصوص دن مقرر نہیں کیا گیا، اِسی اجازت کو پیش نظر رکھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پسند کیا ہے کہ قربانی کے مہینے کی ابتدا ہی سے اِس پر عمل کیا جائے۔ ذی الحجہ کی ابتدا سے یوم النحر تک عبادات کے اِن اوقات کی حکمت پر اگر غور کیا جائے تو صاف واضح ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تلقین حج میں شرکت سے محروم رہ جانے والے ایک بندۂ مومن میں یہ نفسیاتی احساس پیدا کرتی ہے کہ وہ حج میں موجود اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ اِس عبادت کو ادا کرنے میں گویا شریک ہو گیا ہے۔

اِسی ضمن میں ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر نذر کی روایت کے تحت قربانی کی سنت پر عمل ممکن نہ ہو تو کیا اِس صورت میں بھی نذر کی کوئی دوسری عبادت ادا کی جاسکتی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ایک دوسری روایت اِسے واضح کرتی ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر جب آپ سے کسی نے پوچھا کہ میرے پاس قربانی کے لیے جانور نہیں ہے، تو آپ نے فرمایا: جاؤ اپنے ناخن تراشو اور بال کترواؤ، یہی مکمل قربانی سمجھی جائے گی۔

روایت کے الفاظ ہیں:

عن عبد اللّٰہ بن عمرو بن العاص أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم قال لرجل: "أمرت بیوم الأضحی عیدًا جعلہ اللّٰہ عز و جل لھذہ الأمۃ"، فقال الرجل: أرأیت إن لم أجد إلا منیحۃ أنثی أفأضحي بھا؟ قال: "لا ولکن تأخذ من شعرک وتقلم أظفارک وتقص شاربک وتحلق عانتک فذلک تمام أضحیتک عند اللّٰہ عز و جل". (نسائی، رقم ۴۳۶۵)

"عبداللہ بن عمرو بن عاص سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی آدمی سے کہا: مجھے اضحیٰ کے دن کے متعلق حکم دیا گیا ہے کہ اِسے بطور عید مناؤں، جسے اللہ عزوجل نے اِس امت کے لیے خاص کیا ہے۔ ایک آدمی نے پوچھا: میرے پاس تو دودھ دینے والی ایک بکری ہے جو عاریتاً لی ہوئی ہے، کیا اُسی کی قربانی کر دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، بلکہ اپنے بال کاٹ لو، ناخن اور مونچھیں تراش لو اور زیرناف کی صفائی کر لو۔ اللہ کے ہاں تمھاری یہی کامل قربانی شمار ہوگی۔"

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اِس روایت سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے کہ نذر کی قدیم روایت کے تمام اجزا اپنی ذات میں ایک مکمل عبادت ہیں۔ اِن کی ادائیگی ایک دوسرے کے ساتھ مشروط نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حج میں جانور کی قربانی نفل اور اختیاری عبادت ہے، جو ایک حاجی ترک بھی کر سکتا ہے، اِس کے باوجود سر کے بال منڈوانے کی اِس لازمی عبادت پر عمل کرتا ہے۔ لہٰذا جس طرح عیدالاضحیٰ میں جانور کی قربانی اپنے آپ کو خدا کی نذر کرنے کی ایک علامت ہے، اُسی طرح خدا کی غلامی قبول کرنے کی علامت کے طور پر سر منڈوا دینا قربانی کی دوسری عبادت ہے۔ اگر غور کیا جائے تو قربانی کی یہی علامات ہیں جو انسان کو اطاعت اور سرافگندگی کی منتہا تک پہنچا دیتی ہیں۔ قربانی کی اِس حقیقت کو قرآن مجید نے تقابل کے اسلوب میں نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

"کہہ دو کہ میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا، سب اللہ پروردگار عالم کے لیے ہے۔"

(الانعام ۶: ۱۶۲)

صاحب "البیان" اِس آیت کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

"یہ نہایت خوب صورت تقابل ہے۔ بندۂ مومن جیتا ہے تو روز و شب کی ہر کروٹ پر نماز میں ہوتا ہے اور مرتا ہے تو اِسی آرزو میں کہ جان و مال کی جس قربانی کے لیے وہ ہمیشہ تیار رہا، اُس کا پروردگار اُسے قبول کر لے۔ چنانچہ نماز کے مقابل میں زندگی اور قربانی کے مقابل میں موت ہے۔" (البیان ۲/ ۱۲۵)

یہی وجہ ہے کہ اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرنے کی اِن عبادات کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے مناسک حج کا حصہ بنا دیا ہے۔ اِن تمام پہلوؤں پر غور کرنے سے درج ذیل حقائق واضح ہوتے ہیں:

۱۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی یہ روایت دین میں کوئی مستقل عمل نہیں بیان کر رہی، بلکہ نذر اور قربانی کی اُسی قدیم روایت کی ایک عبادت پر تطوعاً عمل کا بیان ہے جس عبادت کے تمام اجزا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج میں اور ایک جز کو عید الاضحیٰ میں بطور سنت جاری فرما چکے ہیں۔

۲۔ جانور کی قربانی کی سنت اجماع اور تواتر عملی سے منتقل ہوئی ہے۔ قربانی سے پہلے بال اور ناخن نہ کاٹنے کی تلقین، نذر کی دونوں عبادتوں پر ایک ساتھ عمل کے آداب کا بیان ہے جو حج اور قدیم الہامی روایت میں پہلے سے جاری تھے۔

۳۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی یہ روایت نذر کی عبادات ادا کرنے کی تلقین اور اُن کے آداب کی یاددہانی پر مشتمل ہے، کوئی نیا حکم ہرگز بیان نہیں کر رہی۔

''میزان'' میں اِس روایت کو قبول کرنے پر دوسرا سوال یہ اٹھایا گیا تھا کہ بال اور ناخن نہ کاٹنے کی پابندی حالت احرام میں مشروع ہے، یہ روایت احرام کی بعض پابندیوں کو غیر حاجیوں تک کیوں پھیلا رہی ہے؟

اِس سوال کا جواب جاننے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اِس بات کا جائزہ لیں کہ حالت احرام میں موجود پابندیوں کی اصل حقیقت کیا ہے اور جن پابندیوں کی توسیع کی گئی ہے، اُن کی حکمت کیا ہے؟

حالت احرام کی پابندیاں یہ ہیں:

۱۔ شکار کی ممانعت۔

۲۔ زیب وزینت سے پرہیز۔

۳۔ زن وشو کے تعلقات سے اجتناب۔

۴۔ بال اور ناخن نہ کاٹنے کا التزام۔

اِن میں سے پہلی پابندی، یعنی شکار نہ کرنے کو قرآن مجید نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے:

''ایمان والو، احرام کی حالت میں شکار نہ مارو۔ (یہ ممنوع ہے)، اور (یاد رکھو کہ) تم میں سے جس نے جانتے بوجھتے اُسے مارا، اُس کا بدلہ تمھارے مواشی میں سے اُسی کے ہم پلہ کوئی جانور ہے، جیسا اُس نے مارا ہے، جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے۔ یہ نیاز کی حیثیت سے کعبہ پہنچایا جائے گا، یا نہیں تو اِس گناہ کے کفارے

میں مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا یا اِسی کے برابر روزے رکھنا ہوں گے تاکہ وہ اپنے کیے کی سزا چکھے۔ اِس سے پہلے جو کچھ ہو چکا، اُسے اللہ نے معاف کر دیا ہے، لیکن اب اگر کسی نے اُسے دہرایا تو اللہ اُس سے بدلہ لے گا۔ اللہ زبردست ہے، وہ بدلہ لینے والا ہے۔'' (المائدہ ۵: ۹۵)

صاحب ''البیان'' اِس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''یہ تنبیہ نہایت سخت ہے۔ ابتلا کے احکام چونکہ بندوں کی وفاداری کا امتحان ہوتے ہیں، اِس لیے اُن کی خلاف ورزی یا اُن سے بے پروائی کی سزا بھی نہایت سخت ہوتی ہے۔ خدا کے ماننے والوں کو اِس پر ہمیشہ متنبہ رہنا چاہیے۔''

(البیان ۱/ ۶۷۹)

اِس آیت سے صاف واضح ہے کہ شکار کی اِس پابندی کا تعلق اصلاً حالت احرام سے ہے، اور اِس پابندی سے مقصود امتحان کا محل بھی حرم ہی کی سرزمین ہے۔

دوسری پابندی زیب و زینت سے پرہیز کی ہے۔ اِس کا تعلق بھی اصلاً احرام کی پابندیوں سے ہے۔ حالت احرام میں ایک انسان کا اپنا لباس ترک کر کے دو چادریں اوڑھ لینا اِسی زیب و زینت سے لاتعلقی کا اظہار ہے۔ قرآن مجید نے مناسک حج کو شعائر، یعنی علامت قرار دیا ہے، ہم جانتے ہیں کہ ہر علامت اصلاً کسی حقیقت کا شعور قائم رکھنے کے لیے مقرر کی جاتی ہے۔ صاحب ''میزان'' کے نزدیک اِن علاماتِ حج میں درحقیقت مومنین کی ابلیس کے خلاف ازل سے جاری جنگ کو ممثل کر دیا گیا ہے، اور احرام باندھنا بھی اِسی مشق کا حصہ ہے۔ وہ حج کے مناسک کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''(حج میں) اللہ کے بندے اپنے پروردگار کی ندا پر دنیا کے مال و متاع اور اُس کی لذتوں اور مصروفیتوں سے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔

پھر 'لبیک لبیک' کہتے ہوئے میدان جنگ میں پہنچتے اور بالکل مجاہدین کے طریقے پر ایک وادی میں ڈیرے ڈال دیتے ہیں۔

اگلے دن ایک کھلے میدان میں پہنچ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے، اِس جنگ میں کامیابی کے لیے دعا و مناجات کرتے اور اپنے امام کا خطبہ سنتے ہیں۔

تمثیل کے تقاضے سے نمازیں قصر اور جمع کر کے پڑھتے اور راستے میں مختصر پڑاو کرتے ہوئے دوبارہ اپنے ڈیروں پر پہنچ جاتے ہیں۔

پھر شیطان پر سنگ باری کرتے، اپنے جانوروں کی قربانی پیش کر کے اپنے آپ کو خداوند کی نذر کرتے،

سر منڈاتے اور نذر کے پھیروں کے لیے اصل معبد اور قربان گاہ میں حاضر ہو جاتے ہیں۔'' (میزان ۴۷۳)

اِس کے بعد احرام کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اِس لحاظ سے دیکھیے تو حج وعمرہ میں احرام اِس بات کی علامت ہے کہ بندۂ مومن نے دنیا کی لذتوں، مصروفیتوں اور مرغوبات سے ہاتھ اٹھالیا ہے اور دو اَن سلی چادروں سے اپنا بدن ڈھانپ کر وہ برہنہ سر اور کسی حد تک برہنہ پا بالکل راہبوں کی صورت بنائے ہوئے اپنے پروردگار کے حضور میں پہنچنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا ہے۔''

(میزان ۴۷۳)

اِس سے واضح ہوتا ہے کہ حج کے دوران زیب و زینت سے پرہیز جس طرح احرام کو لازم کرتا ہے، اُسی طرح حالت احرام میں خوشبو لگانا یا کسی دوسری زینت سے بچنے کی پابندی بھی اِسی کا ناگزیر تقاضا ہے۔

تیسری پابندی زن وشو کے تعلقات سے اجتناب کی ہے، ہمارے نزدیک اِس پابندی کا تعلق حالت احرام میں اُس مقام مقدس پر حج ادا کرنے سے ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

''حج کے متعین مہینے ہیں۔ سو اِن میں جو شخص بھی (احرام باندھ کر) حج کا ارادہ کر لے، اُسے پھر حج کے اِس زمانے میں نہ کوئی شہوت کی بات کرنی ہے، نہ خدا کی نافرمانی کی اور نہ لڑائی جھگڑے کی کوئی بات اُس سے سرزد ہونی چاہیے۔'' (البقرہ ۲: ۱۹۷)

گویا یہ پابندی اصلاً حج میں شرکت اور اِن مخصوص ایام میں اِس مقام مقدس میں مناسک حج ادا کرنے سے متعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۰/ ذوالحجہ کو قربانی کے بعد سر منڈوا کر احرام کھول دیا جاتا ہے اور احرام کی سب پابندیاں اٹھ جاتی ہیں، لیکن اِس کے باوجود زن وشو کے تعلقات اُس وقت قائم نہیں کیے جا سکتے، جب تک طواف افاضہ نہ ادا کر دیا جائے۔ اِس پابندی کا تعلق محض حالت احرام سے ہوتا تو احرام اتارتے ہی اِس کی اجازت ہونی چاہیے تھی، لیکن ہم جانتے ہیں کہ حج کی شریعت میں اِس کی اجازت نہیں ہے۔

چوتھی پابندی بال اور ناخن کاٹنے سے اجتناب کی ہے، ہمارے نزدیک اِس کا تعلق بھی محض احرام سے نہیں، بلکہ حالت احرام میں انجام دینے والی قربانی یا نذر کی اُس قدیم روایت سے ہے جسے مناسک حج کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ جس طرح حج میں طواف اور سعی نذر کی قدیم روایت کے تحت جانور کو معبد کے پھیرے لگوانے کی علامت ہیں، اِسی طرح حج میں قربانی کے بعد سر منڈوانا بھی بالکل اِسی روایت کے تحت ہے۔ اِس پابندی کی ابتدا یقیناً احرام باندھنے کے بعد ہوتی ہے، لیکن اصلاً یہ نذر کی قدیم روایت کی علامات ہیں، جنھیں احرام میں اپنا لیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

حج میں قربانی کے بعد ہی سر منڈوایا جاتا ہے۔

حالت احرام کی پابندیوں کی حقیقت جان لینے کے بعد اب اِس سوال پر غور کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کی پابندیوں میں سے صرف بال اور ناخن نہ کاٹنے کی تلقین کی ہے، باقی پابندیاں کیوں نہیں بیان کیں؟ تو اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الاضحیٰ کے موقع پر جانور کی قربانی کی صورت میں نذر کی ایک عبادت جاری کی ہے، بال اور ناخن نہ تراشنے کا تعلق محض احرام کی پابندیوں سے نہیں، بلکہ نذر کی قدیم عبادت سے ہے، اِسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جانور کی قربانی کا ارادہ رکھنے والے شخص کو نذر کی ایک دوسری عبادت کے اہتمام کی تلقین کی ہے۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مناسک حج میں سے صرف نذر کی عبادات پر ہی عمل کی تلقین کیوں کی؟ تو اِس سوال پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جانور کی قربانی، سر منڈوانے اور ناخن تراشنے اور تکبیرات تشریق کے علاوہ حج میں ادا کیے جانے والے تمام اعمال کا تعلق مقامات حج سے ہے، مثلاً طواف کا تعلق بیت اللہ سے ہے، اِسی طرح سعی کا تعلق صفا اور مروہ سے ہے، رمی کا تعلق جمرات اور وقوف کا تعلق عرفہ کے مقام سے ہے، جب کہ جانور کی قربانی، بال کتروانے اور ناخن تراشنے اور تکبیرات تشریق اپنے مقام سے مجرد ہو کر بھی اپنی حقیقت پوری طرح قائم رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے عید الاضحیٰ میں قربانی کی توسیع کی، نذر کی عبادت سر منڈوانے اور ناخن تراشنے کی تلقین کی اور ایام تشریق میں غیر حاجیوں میں بھی تکبیرات تشریق ادا کرنے کی روایت کو جاری فرمایا۔

تیسرا سوال یہ پیش کیا گیا تھا کہ روایت کے الفاظ اِس ہدایت کو لازم قرار دینے کا تقاضا کر رہے ہیں، لیکن صاحب ''میزان'' نے اِسے لازمی ہدایت کے طور پر قبول نہیں کیا۔ جو اہل علم اِسے لازمی ہدایت میں شمار کرتے ہیں، اُن کا استدلال یہ ہے کہ اِس روایت میں امر کا فعل نقل ہوا ہے اور صیغۂ امر اصلاً وجوب کے لیے آتا ہے۔ اُن کے نزدیک اِسے کسی اور معنی میں مراد لینے کے لیے قرینہ درکار ہوتا ہے، جو یہاں مذکور نہیں، لہٰذا اِس روایت میں بھی صیغۂ امر کے ساتھ جو ہدایت دی گئی ہے، وہ ایک لازمی ہدایت سمجھی جائے گی۔

ہمارے نزدیک اُن کا یہ نقطۂ نظر درست نہیں ہے، اِس لیے کہ کوئی مستقل دینی حکم قرآن وسنت کی محکم بنیاد کے سوا اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ دین کی تمام ہدایات قرآن وسنت کی صورت میں صحابہ کے اجماع اور قولی اور عملی تواتر کے قطعی اور بے شبہ ذرائع سے ہم تک پہنچی ہیں، جب کہ خبر واحد کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ تمام اخبار آحاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی باتوں کا تاریخی ریکارڈ ہیں، جسے لوگ 'روایت بالمعنیٰ' کے اصول پر نقل کرتے ہیں، یعنی راویوں تک

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے کسی موقع کی کوئی بات پہنچی تو اُنھوں نے اِس کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں نقل کر دیا۔ لہٰذا خبر واحد کے الفاظ سے کسی حکم کی فرضیت کا استدلال ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مزید یہ کہ صیغۂ امر سے فرضیت کا جو استدلال کیا جاتا ہے، وہ بھی محل نظر ہے، اِس کی وجہ یہ ہے کہ صیغۂ امر اصلاً وجوب کے لیے نہیں آتا۔ صیغۂ امر وجوب، استحباب، اباحت، ندب، تہدید، تعجیز، احتقار، درخواست، تفویض، تعجب اور اِن کے علاوہ دیگر کئی معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے، صرف قرآن مجید میں دیکھ لیا جائے تو صیغۂ امر اِن سب معنی میں استعمال ہوا۔ مثلاً ارشاد ہوا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ وَاشْکُرُوْا لِلّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ. (البقرہ ۲:۱۷۲)

”ایمان والو، (یہ اگر اپنی اِن بدعتوں کو نہیں چھوڑتے تو اِنھیں اِن کے حال پر چھوڑو، اور) جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمھیں عطا فرمائی ہیں، اُنھیں (بغیر کسی تردد کے) کھاؤ اور اللہ ہی کے شکر گزار بنو، اگر تم اُسی کی پرستش کرنے والے ہو۔“

اِس آیت میں صیغۂ امر محض اباحت کے لیے آیا ہے، یعنی یہاں 'کُلُوْا' صیغۂ امر کہہ کر ہر ایک پر طیبات کھانے کو لازم نہیں کر دیا گیا، بلکہ اِس لفظ کے استعمال سے ایک غلط بات کی تردید کی گئی ہے، اور وہ یہ ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی جائز چیز کو دوسروں پر حرام قرار دے، اللہ تعالیٰ نے جو طیبات پیدا کی ہیں، انھیں کھانا ہو تو بلاتردد کھایا جا سکتا ہے۔

لہٰذا یہ بات کہ امر اصلاً وجوب کے لیے آتا ہے، درست نہیں ہے۔ صیغۂ امر کے معنی کی تعیین کلام کی لفظی صراحت، اُس کا سیاق، عقلی قرائن اور اسلوب ہی کر سکتا ہے۔ مجرد فعل امر کو اصلاً کسی ایک معنی میں قرار دینا زبان اور بیان کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہے۔ ہر صیغۂ امر کا معنی کسی کلام میں اُس مقام پر ہی طے کیا جا سکتا ہے، جہاں متکلم نے اُسے استعمال کیا ہے۔

اب ہم غور کرتے ہیں کہ اِس روایت میں صیغۂ امر کس معنی میں آیا ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جس عمل کے بارے میں صیغۂ امر استعمال کیا ہے، وہ عمل حج میں ایک لازمی پابندی کے طور پر جاری ہے، جسے امت نے اجماع اور تواتر عملی سے منتقل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حج میں اِس کے وجوب پر کوئی اختلاف نہیں ہے، لیکن غیر حاجی کے لیے قربانی کی اِس عبادت کو قرآن وسنت نے لازم کیا ہے، نہ اِس روایت میں اِسے فرض قرار دینے کی لفظاً کوئی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

صراحت موجود ہے۔ لہٰذا یہاں صیغۂ امر وجوب کے معنی میں نہیں ہے۔ اِس روایت میں شارع کا منشا بالکل واضح ہے کہ اگر کوئی قربانی کی عبادت ادا کرنا چاہتا ہے تو اُسے چاہیے کہ وہ نذر کی ایک دوسری عبادت کا بھی اہتمام کرے۔ لہٰذا یہ ایک عبادت پر تطوعاً عمل کا بیان ہے۔ چنانچہ صیغۂ امر یہاں استحباب کے معنی میں ہے۔ اِسے وجوب کے معنی میں استعمال کرنے کی کوئی لفظی صراحت موجود نہیں ہے۔

بالکل یہی صورت ایک دوسری روایت میں بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عَنْ قَيْسٍ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبَا مَسْعُوْدٍ، يَقُوْلُ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَا يَنْكَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ مِنَ النَّاسِ، وَلٰكِنَّهُمَا آيَتَانِ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ، فَإِذَا رَأَيْتُمُوْهُمَا فَقُوْمُوْا فَصَلُّوْا". (بخاری، رقم ۱۰۴۱)

’’قیس بن ابی حازم کہتے ہیں کہ اُنھوں نے ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے سنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سورج اور چاند میں گرہن کسی شخص کی موت سے نہیں لگتا۔ یہ دونوں تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں، اس لیے اسے دیکھتے ہی کھڑے ہو جاؤ اور نماز پڑھو۔‘‘

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اِس روایت میں بھی فعل امر کے ساتھ چاند اور سورج گرہن کے وقت نماز ادا کرنے کا کہا گیا ہے۔ اب یہاں فعل امر کو وجوب کے معنی میں مراد لینے کے لیے کلام میں کوئی لفظی صراحت موجود نہیں ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ شارع نے نماز کو صرف پانچ اوقات میں لازم قرار دیا ہے۔ اِس کے علاوہ ہر نماز نفل ہے۔ لہٰذا یہاں بھی صیغۂ امر استحباب ہی کے معنی میں ہو گا۔

ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی بعض دوسرے طرق میں صیغۂ امر کے بجائے نفی مؤکد کا اسلوب نقل ہوا ہے، روایت کے الفاظ ہیں: 'فلا يأخذن شعرًا و لا يقلمن ظفرًا'*، ہمارے نزدیک یہ اسلوب بھی استحباب ہی کے لیے ہے، تاہم تاکید کا یہ اسلوب اِس ہدایت کو استحباب مؤکد تک لے جاتا ہے، لیکن یہاں بھی اِس تلقین کو لازم قرار دینے کی لفظاً کوئی صراحت مذکور نہیں ہے۔

چوتھا سوال یہ تھا کہ صاحب ’’میزان‘‘ نے نذر کی جس قدیم روایت کا حوالہ دیا ہے، اُن صحائف میں ناخن تراشنے کا ذکر کہیں موجود نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک اِس کی وجہ الہامی صحائف کا منفرد ادبی اسلوب ہے۔ کسی بھی ادبی کلام میں زیر بحث موضوع کے تمام اجزا کو منطقی ترتیب سے بیان کیا جاتا ہے، نہ ہر موقع پر جملہ حدود و شرائط ذکر کر کے کسی

---

* مسلم، رقم ۵۲۳۳۔

عمل کی مکمل تنقیح کی جاتی ہے، ایک ادبی کلام ہمیشہ اپنے مخاطبین کی رعایت سے رواں دواں اسلوب میں بات کرتا ہے اور کسی ہدایت کے تمام اجزا کو بیان کرنے کے بجاے، بسا اوقات ایک جامع علامت کا حوالہ دے کر ہی پوری حقیقت بیان کر دی جاتی ہے۔ بلاغت کی اصطلاح میں اِسے 'علی السبیل التغلیب' کا اسلوب کہا جاتا ہے۔ الہامی صحائف میں بھی قانون و منطق کی کتابوں کی طرح قیود و شرائط اور حکم کی تحدید کا انداز نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک زندہ اور رواں ادبی کلام کی طرح گفتگو کرتے ہیں، مثلاً دیکھیے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو جب صلح حدیبیہ کے موقع پر عمرہ ادا کیے بغیر واپس لوٹنا پڑا تو اللہ تعالیٰ نے اُنھیں تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''یقیناً اللہ نے چاہا تو تم مسجد حرام میں ضرور داخل ہو گے، پورے امن کے ساتھ، اِس طرح کہ اپنے سر منڈواؤ گے اور بال کترواؤ گے، تمھیں کوئی اندیشہ نہیں ہو گا۔'' (الفتح ۴۸: ۲۷)

اِس آیت میں صرف سر منڈوانے اور بال کتروانے کا ذکر ہے جو عمرے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا آخری فریضہ ہے، لیکن اِس ایک فریضے کو پورے عمرے کی ایک جامع تعبیر کے طور پر بیان کر دیا گیا ہے، جس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ عمرے کی جس عبادت کے لیے تم جا رہے ہو، اُس کے تمام مناسک پورے کرو گے، اُس کی تکمیل کے اِس منسک سمیت۔ اِس مقام پر عمرے کے تمام مناسک بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اِس لیے کہ مخاطبین اُن سے بخوبی واقف تھے۔ لہٰذا متکلم نے محض آخری علامت کو بیان کر کے پوری حقیقت کی جانب توجہ مبذول کروا دی ہے۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

یہی اسلوب ایک دوسرے موقع پر بھی ہے، قرآن مجید نے جب یہ بتایا کہ اگر ہدی کے جانور لے کر عمرے کی نیت سے نکلے ہو، اور حرم تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ حائل ہو جائے تو قربانی ہی اس کا قائم مقام ہے، جب تک قربانی نہ کر دی جائے، سر نہیں منڈوایا جائے گا، ارشاد ہوا ہے:

''اور حج و عمرہ (کی راہ اگر تمھارے لیے کھول دی جائے تو اُن کے تمام مناسک کے ساتھ اُن) کو اللہ ہی کے لیے پورا کرو، لیکن راستے میں گھر جاؤ تو ہدیے کی جو قربانی بھی میسر ہو، اُسے پیش کر دو، اور اپنے سر اُس وقت تک نہ مونڈو، جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔'' (البقرہ ۲: ۱۹۶)

یہاں دیکھیے، اصلاً مقصود یہ ہے کہ قربانی کر کے سر منڈوانے تک احرام کی پابندی ختم نہیں ہو گی، لیکن احرام کی اِن سب پابندیوں کا ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ صرف سر منڈوانے کا کہا گیا، کیونکہ مخاطبین جانتے تھے کہ یہی وہ آخری عمل ہے جس کے بعد احرام کی تمام پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں، چنانچہ جب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس ہدایت پر عمل کیا تو جانور ذبح کرتے ہی احرام کھول دیا۔

ہمارے نزدیک یہی وجہ ہے کہ الہامی صحائف نے نذر کی اِس عبادت میں ناخن تراشنے کا ذکر نہیں کیا، بلکہ اِسے سر منڈوانے کی ایک جامع تعبیر سے ادا کر دیا گیا ہے، گویا ناخن تراشنے کی ہدایت اِس میں آپ سے آپ موجود ہے۔ تاہم بائیبل کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو چونکہ خدا نے بطور قوم ایک ذمہ داری کے لیے منتخب کیا تھا، اِس لیے اُن میں اگر باہر سے کوئی لونڈی بھی شامل ہوتی تو پہلے وہ خود کو علامتاً خدا کی نذر کرتی، اور نذر کی جو علامات اُس موقع پر نقل ہوئی ہیں، اُن میں سر منڈوانے کے ساتھ ناخن تراشنے کا ذکر بھی صراحتاً مذکور ہے۔ چنانچہ استثنا میں ہے:

’’اور اُن اسیروں میں سے کسی خوبصورت عورت کو دیکھ کر تُو اُس پر فریفتہ ہو جائے اور اُسکو بیاہ لینا چاہے۔ تو تُو اُسے اپنے گھر لے آنا اور وہ اپنا سر منڈوائے اور اپنے ناخن ترشوائے۔‘‘ (کتاب استثنا ۲۱: ۱۱-۱۲)

لہٰذا یہاں ناخن تراشنے کے صریح ذکر کے بعد سے یہ سوال مکمل طور پر ختم ہو جاتا ہے کہ قدیم الہامی صحائف میں سر منڈوانے کے ساتھ ناخن تراشنے کا ذکر کہیں موجود ہی نہیں ہے۔

پانچواں سوال یہ تھا کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تلقین دورِ صحابہ میں شائع و ذائع کیوں نظر نہیں آتی؟ ہمارے نزدیک، اِس سوال کا وہی درست جواب ہے جو ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرنے والے تابعی سعید بن مسیّب نے دیا تھا۔ صحیح مسلم میں یہ جواب اِس پس منظر میں نقل ہوا ہے کہ عیدالاضحیٰ سے پہلے بعض لوگوں نے بال کتروا لیے تو حمام والوں نے اُنھیں بتایا کہ سعید بن مسیّب اِس سے منع کرتے ہیں۔ ایک راوی کہتے ہیں کہ میں سعید بن مسیّب سے ملا اور پوچھا کہ یہ لوگ جنھوں نے بال کٹوا لیے ہیں، وہ اِس عمل سے بے خبر کیوں ہیں؟ تو سعید بن مسیّب نے اِس کے جواب میں کہا: ’قَدْ نُسِيَ وَتُرِكَ‘، یعنی بھلا دیا گیا، یوں ترک کر دیا گیا (مسلم، رقم ۱۹۷۸)۔ اگر غور کیا جائے تو سعید بن مسیّب کا یہ جواب چند پہلوؤں کو واضح کرتا ہے:

۱۔ صحابہ کی معیت میں وقت گزارنے والے مدینے کے مشہور تابعی سعید بن مسیّب کی نظر میں اِس عمل کے بارے میں پہلے لوگوں کا رویہ نہیں تھا، گویا صحابہ اِس عبادت سے پوری طرح واقف تھے، اِس لیے کہ حج میں نذر کی یہی عبادت ہے جسے صحابہ نے اجماع اور تواترِ عملی سے منتقل کیا ہے اور اُس میں کوئی اختلاف نہیں۔

۲۔ عیدالاضحیٰ سے پہلے بال کتروانے پر حمام والوں کی تنبیہ بھی اِسی جانب اشارہ کرتی ہے کہ معاملہ یوں نہیں ہوا کہ اُس عہد کے تمام لوگ اِس عبادت پر تطوعاً عمل سے بے خبر تھے، بلکہ حمام جہاں لوگوں کے بالعموم بال تراشتے ہیں، وہاں کے لوگ بھی اِس سے بخوبی واقف ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۳۔سعید بن مسیّب کا یہ کہنا کہ ''بھلا دیا گیا اور یوں ترک کر دیا گیا''، بتاتا ہے کہ نذر کی یہ عبادت غیر حاجیوں کے لیے لازم نہیں تھی، بلکہ ایک مستحب عمل تھا، اِس لیے لوگوں کو اُس درجے میں مستحضر نہیں رہا۔اور بعض لوگوں نے اِسے چھوڑ دیا۔

سعید بن مسیّب کی اِس روایت پر غور کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایک نفل عبادت پر تطوعاً عمل لوگوں کی نظر سے اوجھل بھی ہوسکتا ہے۔ بالکل اِسی طرح کا معاملہ آج عمرے کی قربانی میں ہوا ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح حج کے مناسک میں قربانی کو شمار کیا ہے، اُسی طرح عمرے میں بھی قربانی کو جاری فرمایا ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیبیہ کے موقع پر آپ عمرے کی نیت سے جا رہے تھے اور ہدی کے جانور آپ کے پاس تھے، لیکن آج اگر جائزہ لیا جائے تو کم و بیش ساری امت اِسے نظر انداز اور فراموش کر کے ترک کر چکی ہے۔ لٰہذا غور ہمیشہ اِس پہلو پر کرنا چاہیے کہ کسی روایت کے ترک ہونے کے اسباب کیا ہیں، نہ کہ بعض لوگوں کے نسیان اور ترک کو بنیاد بنا کر کسی عمل کی نفی کر دی جائے۔ حج میں جہاں نذر کی اِس عبادت کو لازم کر دیا گیا ہے، وہاں یہ بلا اختلاف ہر عہد میں پورے اہتمام سے جاری ہے، لیکن چونکہ غیر حاجی کے لیے یہ ایک مستحب عمل تھا، اِس لیے معاشرے میں اِس کا اہتمام اُس درجے میں نہیں تھا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

آخری سوال سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک دوسری روایت کے بارے میں تھا۔ وہ روایت کچھ یوں ہے کہ ایک صاحب جو خود تو حج پر نہیں گئے، لیکن اپنے کسی ساتھی کے ہمراہ وہاں قربانی کے لیے جانور بھجوا دیا، اُنھیں یہ تردد لاحق ہوا کہ حج نہ کرنے کی صورت میں محض وہاں قربانی کرنے سے کیا احرام کی پابندیاں لازم ہو جائیں گی؟ اِس پر سیدہ عائشہ نے انھیں جواب دیا۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ مَسْرُوْقٍ، أَنَّهُ أَتَى عَائِشَةَ، فَقَالَ لَهَا: يَا أُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ، إِنَّ رَجُلاً يَبْعَثُ بِالْهَدْيِ إِلَى الْكَعْبَةِ، وَيَجْلِسُ فِي الْمِصْرِ، فَيُوْصِي أَنْ تُقَلَّدَ بَدَنَتُهُ، فَلاَ يَزَالُ مِنْ ذٰلِكَ الْيَوْمِ مُحْرِمًا حَتّٰى يَحِلَّ النَّاسُ. قَالَ: فَسَمِعْتُ تَصْفِيْقَهَا مِنْ وَرَاءِ الْحِجَابِ، فَقَالَتْ: لَقَدْ كُنْتُ أَفْتِلُ قَلاَئِدَ هَدْيِ رَسُوْلِ اللّٰهِ

''مسروق سے مروی ہے کہ وہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ ام المؤمنین، اگر کوئی شخص قربانی کا جانور کعبہ میں بھیج دے اور خود اپنے شہر میں مقیم ہو اور جس کے ذریعے سے بھیجے، اسے اس کی وصیت کر دے کہ اس کے جانور کے گلے میں (نشانی کے طور پر) ایک قلادہ پہنا دیا جائے تو کیا اس دن سے وہ اس وقت تک کے لیے محرم ہو جائے گا

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ فَيَبۡعَثُ هَدۡيَهُ إِلَى الۡكَعۡبَةِ، فَمَا يَحۡرُمُ عَلَيۡهِ مِمَّا حَلَّ لِلرِّجَالِ مِنۡ أَهۡلِهِ، حَتّٰى يَرۡجِعَ النَّاسُ.

(بخاری، رقم ۵۲۴۶)

جب تک حاجی اپنا احرام نہ کھول لیں۔ بیان کیا کہ اس پر میں نے پردے کے پیچھے ام المؤمنین کے اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر مارنے کی آواز سنی اور انھوں نے کہا: میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قربانی کے جانوروں کے قلادے باندھتی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے کعبہ بھیجتے تھے، لیکن لوگوں کے واپس ہونے تک آپ پر کوئی چیز حرام نہیں ہوتی تھی جو آپ کے گھر کے دوسرے لوگوں کے لیے حلال ہو۔''

ہمارے نزدیک اِس روایت میں ایک اطلاقی سوال کا اجمالی جواب دیا گیا ہے۔ ہدی کے جانور بھجوانے پر احرام کی پابندیاں اپنا لینے کی یہ غلط فہمی غالباً قرآن مجید کی اُس ہدایت سے پیدا ہوئی ہے جو حدیبیہ کے موقع پر عازمین عمرہ کو دی گئی تھی کہ جب تک وہ قربانی نہ کر لی جائے، وہ سر نہیں منڈوا سکتے، یعنی وہ اپنا احرام نہیں کھولیں گے۔

سیدہ عائشہ نے اِسی غلط فہمی کا جواب دیا ہے کہ یہ پابندیاں صرف حالت احرام ہی میں ہوتی ہیں، رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہدی کے جانور بھیجنے کے باوجود احرام کی پابندیاں اختیار نہیں کرتے تھے۔ یہ اِس روایت کا پس منظر ہے۔ اِسے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت کی نفی میں پیش کرنے سے پہلے چند پہلوؤں پر غور کرنا چاہیے:

۱۔ سوال کرنے والے نے عیدالاضحیٰ کی قربانی کے ساتھ نذر کی دوسری عبادت پر عمل کا سوال نہیں کیا، بلکہ روایت میں زیر بحث مسئلہ ہدی کے جانوروں سے متعلق ہے۔

۲۔ سیدہ کا جواب اِسی پس منظر میں ہے کہ احرام کی جملہ پابندیاں ہدی کا جانور بھیجنے والوں پر نہیں ہیں۔

۳۔ بال اور ناخن نہ کاٹنے کا اصلاً تعلق نذر کی قدیم روایت سے ہے، محض احرام کی پابندیوں سے نہیں ہے۔

۴۔ سیدہ عائشہ کی روایت میں قربانی کے موقع پر نذر کی ایک دوسری عبادت ادا کرنے کی نفی نہیں کی گئی ہے۔

ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت کو ''میزان'' میں قبول کرنے پر جو سوالات اٹھائے گئے تھے، ہم نے استاذ مکرم جاوید احمد غامدی کے اصولوں کی روشنی میں اُن کا جائزہ لیا اور یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ ''میزان'' میں جب کسی خبر واحد کو قبول کیا جاتا ہے تو اُس کے پس منظر میں کیا فکر کارفرما ہوتی ہے۔ صاحب ''میزان'' کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تلقین ایک مشروع عبادت پر تطوعاً عمل کا بیان ہے۔ اور قربانی سے پہلے بال اور ناخن نہ کاٹنا نذر کی قدیم

عبادات کو جمع کرنے کے آداب کا تقاضا ہے جنھیں حج میں ایک سنت کی حیثیت سے جاری کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ روایت دین میں کوئی مستقل عمل بیان کر رہی ہے، نہ کوئی نیا حکم دے رہی ہے۔

ہمارے نزدیک یہی معاملہ ''میزان'' میں زیر بحث اُن بارہ سو سے زائد روایات کا ہے، جنھیں صاحب ''میزان'' نے قبول کیا ہے۔ وہ تمام روایات بھی دین کے احکام کی تفہیم و تبیین پر مشتمل ہیں، اِس میں کسی قسم کا کوئی اضافہ یا کمی نہیں کر رہیں۔ اِس بحث کو دقت نظر سے دیکھنے سے یہ پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کسی خبر واحد پر غور و فکر کا صحیح علمی طریقہ کیا ہے اور صاحب ''میزان'' کے ہاں اِس کے رد و قبول میں کس درجہ کا تفحص اور احتیاط ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

"Note from Publisher: Al-Mawrid is the exclusive publisher of Ishraq. If anyone wishes to republish Ishraq in any format (including on any website), please contact the management of Al-Mawrid on info@al-mawrid.org. Currently, this journal or its contents can be uploaded exclusively on Al-Mawrid.org, JavedAhmadGhamidi.com and Ghamidi.net"

Monthly
ISHRAQ
Lahore

Nov 2018
Vol.30 No.11
Regd No.CPL-183

Publisher : javed Ahmad Ghamidi printers : Qaumi Press, 50 Lower Mall Lahore